انتخاب کلامِ حسرت

مرتّبہ

مسعود الحسن صدیقی

شاہین بک اسٹال سرینگر

باجازت حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

قیمت تین روپے آٹھ آنے

یونین پریس - دہلی

داستان حسرت

داستانِ حسرت

سید فضل الحسن نام حسرت تخلص، سالِ پیدائش ۱۸۸۵ء بمقام قصبہ موہان ضلع اناؤ، اور سالِ وفات ۱۹۵۱ء بمقام لکھنؤ، والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔

حسرت کے جدِ امجد سید محمود نیشاپور کے رہنے والے تھے جو ترکِ وطن کر کے قصبہ موہان میں مستقل سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

حسرت موہانی نے ابتدائی تعلیم میانجی غلام علی موہانی سے حاصل کی ۱۸۹۴ء میں موہان ہائی اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پورے صوبے میں اول آئے۔ بقول خود حسرت کی شاعری کی ابتدا ۱۸۹۵ء سے پہلے ہوئی۔ ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ ہائی سکول فتح پور سے انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا جس پر انھیں سرکاری وظیفہ بھی ملا اور یہیں مولانا سید ظہور الاسلام سے عربی اور فارسی کی تکمیل کی فتحپور سے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علیگڈھ پہنچے اور ۱۹۰۳ء میں انھوں نے بی۔ اے کا امتحان ریاضی اور عربی کے اختیاری مضامین کے ساتھ پاس کیا۔ اور امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی انھوں نے علیگڈھ سے "اردوئے معلیٰ" نامی رسالہ جاری کیا جو کسی نہ کسی طرح ۱۹۲۹ء تک جاری رہا۔ "اردوئے معلیٰ" میں ادبی مضامین کے علاوہ مذہبی اور سیاسی مضامین بھی ہوتے تھے، جن میں حسرت نے آزادی کا چرچہ انتہائی دلیری اور بے باکی سے کیا۔

۱۹۰۶ء میں حسرت کانگریس میں شامل ہو گئے اور ۱۹۰۸ء میں ایک سیاسی مضمون کے سلسلہ میں دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں پھر دو سال کی سزا کے بعد رہا ہونے پر نظر بند کر دیے گئے۔ نظر بندی سے جب نجات ملی تو حسرت نے کانپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جب ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا تو حسرت نے اس میں نمایاں حصّہ لیا اور تحریک ترکِ موالات میں شامل ہو گئے ۱۹۲۲ء میں تیسری بار پھر دو سال کے لئے قید کر دیے گئے۔

حسرت کو کمیونزم کے مقاصد سے شروع ہی سے ہمدردی تھی اس لئے ۱۹۲۵ء میں انھیں کی کوششوں سے پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس کانپور میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حسرت ہی تھے۔ ۱۹۳۵ء میں مولانا نے چند احباب کی اعانت سے ایک آزاد پارٹی بنائی جس کا مقصد کامل آزادی کے حصول کے لئے

ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کی مخلصانہ سعی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں حسرت مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ لیکن اُن کا نصب العین ہمیشہ کامل آزادی رہا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یو۔پی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

تقسیم ہند کے بعد حسرت ہندوستان ہی میں رہے اور پارلیمنٹ کے ممبر چُن لئے گئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں مولانا نے آخری بار حج کیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء ہی سے اُن کی صحت گرنے لگی تھی۔ آخر ۱۳ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کو بارہ بجے دن رحلت فرمائی اور باغ مولانا انوار لکھنؤ میں سپردِ خاک کئے گئے۔ حسرت نے اپنی پوری زندگی پر صرف ایک ہی شعر میں تبصرہ کر ڈالا ہے:۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم ؛ ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

انسانِ کامل ا۔ حسرت موہانی بیک وقت کٹر مسلمان صوفی صافی۔ حریت پسند لیڈر۔ پکے عاشق اور سچے شاعر تھے حسرت کو جس رُخ سے چاہیے دیکھیے وہ منفرد اور یکتا نظر آئیں گے۔ وہ تمام عمر خدا کے دروازے کے فقیر رہے اسی باعث وہ ہر طرح مستغنی۔ بے باک اور نڈر تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت ؛ بڑی ہستی مری ہے اور بڑا ڈول

اُن کی حق گوئی اور بیباکی کا یہ عالم تھا کہ سچی بات کے اعلان سے کبھی باز نہ رہے، اور کبھی کسی بڑی سے بڑی ہستی سے بھی مرعوب نہ ہوتے۔ مولانا صرف اپنی بیوی سے ڈرتے تھے، یہ محض اس لئے کہ وہ اُن سے بے پناہ محبت کرتے تھے، یہ بات ثابت شدہ ہے کہ مولانا کی سیرت کی تعمیر اور اُن کی ادبی اور سیاسی خدمات میں اُن کی چہیتی بیگم مرحومہ نشاط النساء کا بڑا حصّہ تھا۔ بیوی سے جو والہانہ شیفتگی مولانا کو تھی اس کی شہادت میں بہت سے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں مگر میں یہاں اُن کی ایک غزل کے صرف چند اشعار پر اکتفا کروں گا جو انھوں نے بیوی کے انتقال کے بعد کہے:۔

وجہ کیا خواب میں نہ آنے کی ؛ شرم انھیں ہو نہ رُوٹھ جانے کی
اب وہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق ؛ توڑ دوں کنجیاں خزانے کی
مِٹ گئیں آپ بھی مِٹا کے تجھے ؛ سختیاں خود بخود زمانے کی
سُرمۂ چشم عیش تھی بخدا ؛ خاک تیرے غریب خانے کی

غیر ممکن ہے ترے بعد ہوس ؛ دل کسی اور سے لگانے کی
بعد ان کے یہ کیا ہوئی حسرت ؛ دل فریبی ترے فسانے کی

اور آخر کار "یہ بندۂ بندگانِ حضرتِ عشق" "حسرت" سرفرازِ سوائی ہو کر رہا۔ یہ حضرت ہی کی کارفرمائی اور معجز نمائی ہی تھی کہ بیوی سے ڈرنے والا حسرت نڈر عاشق، عارفِ کامل، سید الاحرار، مجاہدِ ملت، رئیس المتغزلین اور خدا جانے کیا کیا بنتا چلا گیا۔ مولانا شبلی ایک خط میں حسرت کو لکھتے ہیں "تم انسان ہو یا جن۔ پہلے شاعر تھے پھر پالٹیشن بنے، اور اب ادیب بنے ہو۔"

حسرت واقعی جن تھے یا کچھ اور، اس کا فیصلہ وہ خود بھی نہ کر سکے۔ کیونکہ ہماری اور آپ کی طرح خود وہ بھی تعجب میں مبتلا ہیں۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی ؛ اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب ہیں کہ اس نے ایک ہی زمانے میں گاندھی محمد علی جناح مولانا ابوالکلام آزاد حسرت موہانی اور شبلی نعمانی وغیرہم جیسی یکتائے روزگار اور مقتدر ہستیاں پیدا کیں لیکن ان سب میں عجوبۂ روزگار ہستی ابوالکلام آزاد اور طرفہ تر ہستی مولانا حسرت موہانی کی تھی کہ خدا نے شرفِ انسانیت کی تمام خوبیاں اِن دونوں ہستیوں میں جمع کر دی تھیں اور پھر لطف یہ کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی خوبیوں کے قدردان بھی تھے۔ حسرت موہانی کی بیباکی اور دلیری کا یہ عالم تھا کہ وہ گاندھی جی۔ ولبھ بھائی پٹیل اور ابوالکلام آزاد جیسی ہستیوں سے بھی مرعوب نہ ہوئے۔ جب کسی بات پر مخالفت پر اتر آتے تو پھر سچائی کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے خواہ مخالف افلاطون ہو یا فرعون۔ رشید احمد صدیقی نے کیا خوب کہا ہے کہ سیاست کوئلے کا کاروبار ہے جس میں سبھی کا ہاتھ تھوڑا بہت کالا ہوتا ہے۔ سوائے حسرت کے"

جب ۱۹۴۷ء میں کانگریسی حکومت کے اشارے سے آزاد مسلم کانفرنس لکھنؤ میں بلائی گئی تو مولانا آزاد اس میں پیش پیش تھے بمقصد یہ تھا کہ مسلم زعما بھی اس کانفرنس میں شرکت کریں اور مسلمانوں کو حالات کے مطابق بدل جانے پر آمادہ کریں۔ حسرت اپنے ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کے روزنامچے میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں

"آج ہم پانچ نمائندے ابوالکلام آزاد صاحب سے بات چیت کرنے کو پہنچے۔ مختصر گفتگو کے دوران معلوم ہو گیا کہ میں نے جلسہ مشاورت میں جو بدگمانی مولانا آزاد کی نیت کے متعلق ظاہر کی تھی وہ خود ان کی زبانی بھی متحقق ہو گئی، انھوں

نے صاف صاف اقرار کیا کہ آج کی کانفرنس کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ تمام مسلم ادارے سیاسی حیثیت سے ختم ہوں اور کل فرقہ وارانہ جماعتیں کانگریس میں مدغم ہوجائیں، اس پر ہم لوگ یہ کہہ کر چلے آئے "تو ہم لوگوں کی شرکت بالکل بیکار ثابت ہوگی" دورانِ گفتگو میں چلتے چلتے میں نے ایک فقرہ ابوالکلام کے متعلق چسپت کر دیا جس سے اُن کی ساری کارستانیوں پر پانی پھر گیا۔ اور جس سے وہ انتہا درجے بھنّائے، میں نے کہا "۱۸۵۷ء میں برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے اور سیاسی وفاداری برطانیہ کی تلقین کی، اسی طرح اب کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو بلاشرط وفاداری سکھاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور کے لئے محدود کر دینے کے درپے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ"

اسی طرح پارلیمنٹ میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کے انتہائی عروج کے زمانے میں اُن کو مخاطب کر کے فرمایا "تم نے وہی کام کیا ہے جو ہسٹنگیز، ویلزلی اور کلائیو نے کیا تھا۔ تم نے اپنی طاقتور فوج کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادیاں چھینی ہیں، تمہارے محکمے پر خدا کی لعنت ہو" اسی طرح وہ دستور سازی میں حصہ لیتے رہے، لیکن دستور مکمل ہونے کے بعد چونکہ وہ مولانا کی مرضی کے مطابق نہ تھا اس پر انھوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ۱۹۲۹ء میں سائمن کمیشن کے ہندوستان آنے کے زمانے میں گاندھی جی کی مخالفت بھی انھوں نے اسی بے باکانہ طریقہ پر کی۔ اسی طرح وہ شاعری کے میدان میں بھی سب سے بالا اور برتر رہے اور صحیح معنوں میں رئیس المتغزلین مانے گئے۔ شعر و ادب میں حسرت کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اسی لئے تمام استادانِ سخن کا رنگ اُن کے کلام میں جذب ہو کر ایسا نکھرا کہ ہر پڑھنے والا بے ساختہ چیخ اٹھا۔ "آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"

ایک شعر میں خود فرماتے ہیں:۔

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض ✿ غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن

غرضکہ بقول فراق "حسرت بیش روایوں کے انداز بیان، وجدان اور فنِ شاعری کی تکمیل ہیں" اسی باعث ان کا یہ دعویٰ برحق ہے۔

غزل گوئی رہی یکتا بیانِ عاشقاں میری ✿ کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری

میں صرف اس پر اتنا اضافہ اور کر نا حق بجانب سمجھتا ہوں کہ حسرت کی غزل گوئی جس طرح جب یکتا تھی اب بھی ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گی۔

ساحر بھوپالی

۱۶ جنوری ۱۹۶۰ء ۔ دہلی

حصۂ اوّل

از

سنہ ۱۹۰۳ء تا سنہ ۱۹۱۲ء

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزوئے سپاس کا
جبکہ صفاتِ یار میں دخل نہ ہو قیاس کا

عشق میں تیرے دل ہوا ایک جہانِ بیخودی
جانِ خزینہ بن گئی حیرتِ بے قیاس کا

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

لطف و عطائے یار کی عام ہیں بسکہ شہرتیں
قلبِ گناہگار میں نام نہیں ہراس کا

دل کو ہو تجھ سے واسطہ، لب پہ ہو نامِ مصطفےٰ
وقت جب آئے اے خدا خاتمہ حواس کا

طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ
جانِ امیدوار کا حسرتِ محوِ یاس کا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اِک حشر برپا کر دیا

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منور جان و دل
شمع جب روشن ہوئی گھر میں اُجالا کر دیا

تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہ سکوں
دردِ دل اُس نے تو حسرتؔ اور دونا کر دیا

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا
حسرتؔ کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا

ہے ایک درِ پیرِ مغاں تک تو رسائی
ہم بادہ پرستوں کا کہاں اور ٹھکانا

مخصوصِ غمِ عشق ہیں ہم لوگ ہمارا
اچھا نہیں اے گردشِ افلاک ستانا

صد شکر غمِ ہر دو جہاں سے ہے وہ فارغ
جو دل ہے ترے تیرِ محبت کا نشانا

اب عشق کا وہ حال ہے نہ حسن کا وہ رنگ
باقی ہے فقط عہدِ تمنّا کا فسانا

آتی ہے تری یاد سو حسرتؔ کو شبِ غم
ہر بار اسے افسانۂ دل کہہ کے سُنانا

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا
ساغر کو رنگِ بادہ نے پرنور کر دیا

مانوس ہو چلا تھا تسلّی سے حالِ دل
پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ
لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا

اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ رُوئے یار
یاں تک حجابِ نور نے مستور کر دیا

حسرتؔ بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند
تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

ہم نے کس دن ترے کوچہ میں گزارا نہ کیا
تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریٔ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

محفلِ یار کی رہ جائے گی آدھی رونق
ناز کو اُس نے اگر انجمن آرا نہ کیا

طعنِ احباب سُنے سرزنشِ خلق سہی
ہم نے کیا کیا تری خاطر سے گوارا نہ کیا

جب دیا تم نے رقیبوں کو دیا جامِ شراب
بھُول کر بھی مری جانب کو اشارا نہ کیا

گر یہی ہے ستمِ یار تو ہم نے حسرتؔ
نہ کیا کچھ بھی جو دُنیا سے کنارا نہ کیا

ہجومِ بیکسی کو وجہ لطفِ بیکراں پایا
کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا

مگر کتھا رنگ بزمِ یار میں نیرنگِ عالم کا
کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو شادماں پایا

ستم سمجھے ہوئے تھے ہم تری بے اعتنائی کو
مگر جب غور سے دیکھا تو اک لطفِ نہاں پایا

کسے فرصت تمہاری جستجو کے شوقِ بیحد سے
ابھی ہم نے کہاں ڈھونڈھا ابھی ہم نے کہاں پایا

نہ پا سکتے کبھی پابند رہ کر قیدِ ہستی میں
سو ہم نے بے نشاں ہو کر تجھے او بے نشاں پایا

ہنسی عبرت بہت جب رنگِ گل کی بے ثباتی نے
چمن میں عندلیبِ سادہ دل کو شادماں پایا

نہ جانے کوئی میری وضعِ رسوا پر کہ اے حسرتؔ
کمالِ عاشقی نے مجھ کو یکتائے زماں پایا

پیہم دیا پیالۂ مے برملا دیا
ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا

اس حیلہ جو نے وصل کی شب ہم سے رُوٹھ کر
نیرنگ روزگار دو عالم دکھا دیا

اللہ ری بہار کی رنگ آفرینیاں
صحنِ چمن کو تختۂ جنّت بنا دیا

اب وہ ہجومِ شوق کی سرمستیاں کہاں
مایوسیٔ فراق نے دل ہی بجھا دیا

حسرتؔ یہ وہ غزل ہے جسے سُن کے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

سادگی ہائے تمنّا کے مزے جاتے رہے
ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا

وائے ناکامی نہ سمجھا کون ہے پیشِ نظر
ہیں کہ حُسنِ یار کا محوِ تماشا ہو گیا

بعد مدّت کے ملے تو شرم مجھ سے کس لئے
تم نئے کچھ ہو گئے یا میں نرالا ہو گیا

شورشیں جاتی رہیں وہ آرزوئے وصل کی
رنجِ دُوری مرہمِ زخمِ تمنّا ہو گیا

سحر وہ کیا تھا نگاہِ آشنائے یار میں
جو دلِ بیمار کے حق میں مسیحا ہو گیا

ضبط سے رازِ محبت کا چھپانا تھا محال
شوق گر پنہاں ہوا غم آشکارا ہو گیا

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہو گیا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حُسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جبکہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حُسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تو نے حسرتؔ کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

مٹتا ہے مٹائے سے اب شوق کہیں تیرا
ہے پیشِ نظر ہر دم حُسنِ نمکیں تیرا

اے قصرِ امارت کی ویرانی و بربادی
کس گوشۂ عبرت میں سوتا ہے مکیں تیرا

آنکھوں کے تبسّم نے سب کھول دیا پردہ
ہم پر نہ چلا جادو اے چین جبیں تیرا

جز کثرتِ محرومی، جز غایتِ دلگیری
مونس نہ ہوا کوئی اے جانِ حزیں تیرا

مرغوب تمنّا ہے، محبوبِ دل و جاں ہے
ہر وضعِ جفا تیری، ہر شیوۂ کیں تیرا

ہم خوب سمجھتے ہیں حسرتؔ سے تری باتیں
اقرار کا پردہ ہے انکار نہیں تیرا

کیا کہیئے آرزوئے دلِ مبتلا ہے کیا
جب یہ خبر بھی ہو کہ وہ رنگیں ادا ہے کیا

کافی ہیں میرے بعد پریشانیاں تری
ہیں کشتۂ وفا ہوں مرا خوں بہا ہے کیا

وقتِ کرم نہ پوچھے گا لطفِ عمیم یار
رندِ خراب حال ہے کیا پارسا ہے کیا

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیری محل سرا کا یہی راستا ہے کیا

ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

یوں شکرِ جور کرتے ہیں تیرے ادا شناس
گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں گلا ہے کیا

رونے لگے ابھی سے کہ ہے ابتدائے حال
تم نے ابھی فسانۂ حسرتؔ سُنا ہے کیا

غضب ہے دل کا حالِ شوق اُن سے بے محل کہنا
مگر کا ہے کو مانے گا یہ پابندِ اجل کہنا

ارادے تھے کہ ان سے حالِ دل سب مل کے کہینگے
مگر ملنے پہ ہم سے آج ہوتا ہے نہ کل کہنا

غضب میں جان ہے پابندئ آدابِ الفت سے
کہ ہر ہر بات کو در پردہ کہنا فی المثل کہنا
پسند آیا طریقِ شاعری تیرا ہمیں حسرتؔ
کہ جب کہنا کبھی کچھ نغز کہنا بے بدل کہنا

ادا نہ ہم سے ہوا حق تری غلامی کا
نصیب شوق رہا داغِ ناتمامی کا
بچھی ہیں راہِ تمنّا میں سینکڑوں آنکھیں
کہ ناز جلوہ کرے تیری خوشخرامی کا
حضور مجھ پہ نہ ضائع کریں عطا اپنی
کہ مستحق ہوں جفا ہائے التزامی کا
بقدرِ شوق کہاں تابِ التماس ہمیں
لکھیں جواب جو اس نامۂ گرامی کا
نہاں نہ ہو کرمِ یار میں ستم حسرتؔ
تہمت نہ کیجئے اظہار شادکامی کا

اِک برق تپاں ہے کہ تکلّم ہے تمہارا
اک سحر ہے لرزاں کہ تبسّم ہے تمہارا
پایا جو مجھے در پئے اظہارِ تمنا
بولے وہ سراسر یہ توہّم ہے تمہارا
اشکوں سے یہ ہے خواہشِ دیدار کو شکوہ
کچھ آج غضب رنگ تلاطم ہے تمہارا
دیکھے نہ ہمیں کوئی محبّت کی نظر سے
کیا خوب یہ انداز تحکّم ہے تمہارا
اب اُن سے کہو آرزوِ شوق نہ حسرتؔ
وہ حسنِ بیاں آج کہاں گم ہے تمہارا

جو نازِ حسن سے کی تھی کبھی غرور کی بات
سو آج تک ہے مجھے یاد وہ حضور کی بات
بہ دیر جا کے ہوا ختم سلسلہ اُن کا
چلی جو اہلِ خرابات میں سرور کی بات

مزاجِ یار مکدر عدو سے کیوں ہوتا
ضرور کوئی نہ کوئی ہوئی فتور کی بات

میں دل کی آنکھ سے دیکھوں نہ چشمِ سر سے انہیں
کہ پھر نہ پیشِ نظر ہو وہ کوہِ طور کی بات

نہ پوچھئے کہ ہوئی حسن کی عجب حالت
سنی جو پہلے پہل عشقِ ناصبور کی بات

ملے بھی وہ تو غرورِ جمال نے نہ سنی
زبانِ دل سے تمنائے بے شعور کی بات

وہ بے سبب ہیں خفا مجھ سے کیا کہوں حسرت
مجھے تو یاد نہیں ہے کوئی قصور کی بات

رنگ یہ لایا ہجومِ ساغر و پیمانہ آج
بھر گئی سیرابیوں سے محفلِ رندانہ آج

بس کہ زیبِ انجمن ہے جلوۂ جانانہ آج
ہے سراپا آرزو ہر عاشقِ دیوانہ آج

یہ ہوا بیتابیوں پر تشنۂ مے کا اثر
کہہ دیا سب اُن سے حالِ شوقِ گستاخانہ آج

رشک سے مٹ مٹ گئے ہم تشنہ کامانِ وصال
جب ملا لب ہائے ساقی سے لبِ پیمانہ آج

ہے فروغِ بزمِ یکتائی جو وہ شمعِ جمال
آ گئی ہے دل میں بھی بینائیِ پروانہ آج

غرق ہے رنگینیوں میں مستیوں سے چور چور
ہے سراپا بے خودی وہ نرگسِ مستانہ آج

مل گیا اچھا سہارا عذرِ مستی کا ہمیں
لے گیا آغوش میں اُس گل کو بے باکانہ آج

خم لگا دے ہم بلانوشوں کے منھ میں ساقیا
کام آئے گا نہ ساغر آج نے پیمانہ آج

میں ہی اے حسرت نہیں محوِ جمالِ روئے یار
پڑ رہی ہیں سب نگاہیں اس پہ مشتاقانہ آج

مجبور مجھ کو جان کے عہدِ وفا کے بعد
بے مہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد

اہلِ رضا کی جان ہے اتنی سی یہ اُمید
کچھ اور بھی ہے اس ستمِ برملا کے بعد

مجبوریٔ سوال سے اس چشمِ ناز میں
منظوریوں کا رنگ عیاں ہے حیا کے بعد

نے راحتِ سرور نہ تکلیفِ اضطراب
باقی نہیں ہے کچھ بھی دلِ مبتلا کے بعد

تم پر مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

افزوں ہوئیں کچھ اور محبّت کی شورشیں
تجدیدِ یادِ آرزو جو ہوئی التوا کے بعد

دامانِ صبر ہاتھ سے حسرتؔ نہ دیجیو
گر خواہشِ طرب ہے ہجومِ بلا کے بعد

کچھ دردِ دل سے بڑھ کے ہے دردِ جگر لذیذ
تجھ سے ہیں جتنے درد وہ سب ہیں مگر لذیذ

مایوسیوں سے کام نہ لے جانِ مبتلا
رنجِ فراقِ یار بھی ہے سر بسر لذیذ

جانِ حزیں کو بھول گئی سختیٔ فراق
کچھ اس قدر ہے گریۂ وقتِ سحر لذیذ

کہتا ہے کون شورشِ باطن کو بے مزا
مرغوبِ شوق کیوں ہے نہیں ہے اگر لذیذ

اشکِ وفا سے دامنِ حسرتؔ ہو لالہ رنگ
پی جائے گر نہ پا کے انھیں چشمِ تر لذیذ

عشق کی روحِ پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر
اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر

غمزۂ دل فریب کو اور بھی جاں فزا بنا
پیکرِ نازِ حسن پر رنگِ حیا زیاد کر

خرمیٔ دو روزہ کو عشرتِ جاوداں نہ جان
فکرِ معاش سے گزر حوصلۂ معاد کر

اے کہ نجات بندگی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمّتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

غیر کی جدّ و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ　　کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر　　مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب　　ہمارے مٹانے پہ تیّار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو　　کہ ہم بھی رہیں اُن سے بیزار ہو کر
کہیں صُلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو　　نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت　　وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

ہے غضب ہنگامۂ فصلِ بہار اب کی برس　　دل پہ کاہے کو رہے گا اختیار اب کی برس
ہے جنونِ شوق ابھی سے بیقرار اب کی برس　　کیا غضب ڈھائیگا طوفانِ بہار اب کی برس
کامیابی جلد ہو گی آ کے پابوسِ اُمید　　کھینچ ڈالیں اور رنج انتظار اب کی برس
حادثے سنہ آٹھ میں گذرے بہت اب دیکھئے　　کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار اب کی برس
فرقتِ ساقی میں ہم حسرت کشانِ بادہ سے　　مِل کے رویا خوب ابرِ نوبہار اب کی برس
مدّتیں ترکِ محبّت کو ہوئیں پھر اے عجب　　یادِ یار آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس
جوشِ گل کی ہیں یہی کیفیتیں تو کیا عجب　　اشکِ بلبل سے قفس ہو لالہ زار اب کی برس
حسرتِ شوریدہ سر ہے پائمالِ اشتیاق　　اس طرف بھی کر گزر اے شہسوار اب کی برس

کچھ ہم کو عجب گریۂ مستی میں بلا حظ
ایسا تو کسی شے میں نہ ہوگا بخدا حظ

کیا آئے اگر آئے کبھی دم بھر کے لئے تم
اس سے تو بڑھا دردِ جگر اور کجا حظ

مرغوبِ دل و جاں تمنا ہے، نہ کیوں ہو
رکھتا ہے غمِ شوق ترا حد سے سوا حظ

پوچھے کوئی رندانِ سیہ مست کے جی سے
کیا کچھ نہ انھیں خدمتِ ساقی میں ملا حظ

اچھا ہے اگر فصلِ گل آئی ہے جہاں میں
کیا اس سے مگر پائیں گے ہم بے سروپا حظ

تم مشقِ جفا چھوڑ دو گر ہو تمہیں معلوم
رکھتی ہے جو پابندیٔ آئینِ وفا حظ

ہے پاسِ ادب رسمِ قدیمِ شعرا کا
حسرت نہیں اس قسم کے اشعار میں کیا حظ

تجھ سے ہے حسن و جمالِ دو جہاں کی رونق
اے تری یاد مرے خانۂ جاں کی رونق

یاد میں اُس گلِ رعنا کے جو نکلے آنسو
بن گئے دیدۂ خوننابہ فشاں کی رونق

جاں گزیں جب سے ہوئی تیری محبت دل میں
بڑھ گئی اور بھی اس جنسِ گراں کی رونق

مقدمِ یار کی آنکھوں میں بسی ہے جو بہار
قابلِ دید ہے چشمِ نگراں کی رونق

ہر طرف رندی و مستی کا نمودار ہے رنگ
ہے خرابی سے خراباتِ مغاں کی رونق

کیا نہیں شوقِ شہادت کا یہ کافی اعزاز
کہ مرا سر ہے ترے نوکِ سناں کی رونق

تیرے حسنِ نظر افروز کے جلوے اے شوخ
ہو گئے ہیں نگہِ دیدہ وراں کی رونق

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت اثر و حسنِ بیاں کی رونق

محروم وفا ہے دلِ دلگیر ابھی تک
باقی ہے ترے عشق کی تاثیر ابھی تک

وصل اس بُتِ بدخو کا میسّر نہیں ہوتا
وابستۂ تقدیر ہے تدبیر ابھی تک

اِک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود
اے جانِ تمنّا تری تقریر ابھی تک

سیکھی تھی جو آغازِ محبت میں قلم نے
باقی ہے وہ رنگینیٔ تحریر ابھی تک

اس درجہ نہ بیتاب ہو اے شوقِ شہادت
ہے میان میں اُس شوخ کی شمشیر ابھی تک

کہنے کو تو میں بھول گیا ہوں مگر اے یار
ہے خانۂ دل میں تری تصویر ابھی تک

بھُولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی
پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

تھے حق پہ وہ بیشک کہ نہ ہوتے تو نہ ہوتا
دُنیا میں بپا ماتمِ شبیر ابھی تک

گزرے بہت اُستاد مگر رنگِ اثر میں
بے مثل ہے حسرت سخنِ میر ابھی تک

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہُوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لئے ہیں چلن تمام

اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خودبخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
بیہوش اِک نظر میں ہوئی انجمن تمام

ہے نازِ حسن سے جو فروزاں جبینِ یار
لبریز آبِ نور ہے چاہِ ذقن تمام

اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام
گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

اچھا ہے اہلِ جور کئے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حبِّ وطن تمام

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گدازِ میرؔ
حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں
اب تجھے اے ستمِ یار کہاں سے لاؤں

پرسشِ حال پہ ہے خاطرِ جاناں مائل
جرأتِ کوششِ اظہار کہاں سے لاؤں

ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز
التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں

نور عنقا ہے شبِ ہجر کی تاریکی میں
جلوۂ صبح کے آثار کہاں سے لاؤں

صحبتِ اہلِ صفا خوب ہے مانا لیکن
رونقِ خانۂ خمار کہاں سے لاؤں

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

اے تلکؔ اے افتخارِ جذبۂ حُبِّ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن

تجھ سے قائم ہے بنا آزادیٔ بیباک کی
تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و صفا کی انجمن

سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند
خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قیدِ محن

ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن

تو نے خودداری کا پھونکا اے تلکؔ ایسا فسوں
یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن

ناز تیری پیروی پر حسرتِ آزاد کو
اے تجھے قائم رکھے تا دیر ربِّ ذوالمنن

گرفتارِ محبّت ہوں اسیرِ دامِ الفت ہوں
میں سوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

عجب انداز ہے میرے مزاجِ لاابالی کا
نہ ممنونِ تمنّا ہوں نہ مشتاقِ مسرت ہوں

مری بیتابیوں کا قول ہے ہم جانِ تمکیں ہیں
مری افتادگی کہتی ہے تاجِ فرقِ عزت ہوں

مرا شوقِ سخن پروردۂ آغوشِ حرماں ہے
میں خود شیدائے غم ہوں رفتۂ دردِ محبّت ہوں

نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا
تکلّف برطرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں

کمالِ خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرت
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

گریباں چاک ہیں گلہائے رنگیں صحنِ بستاں میں
قیامت کا اثر تھا نالہ ہائے عندلیباں میں

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے
تغافل ہائے پیدا میں نوازش ہائے پنہاں ہیں

نگاہِ شوق کیوں کر کامیابِ شادمانی ہو
غضب کا رعب ہے اس شوخ کے حسنِ نگہباں میں

مجھے معلوم ہے پھر جوشِ الفت رخنہ ڈالے گا
ترے عہدِ تغافل میں مرے پیمانِ حرماں میں

تمہارے حسنِ روزافزوں کے جلوے کیا قیامت ہیں
نگاہِ شوق کی بھی جا نہیں ہے چشمِ حیراں میں

الٰہی خیر میرے عہدِ ترکِ مے گساری کی
ہجومِ شوق میں ہنگامۂ فصلِ بہاراں میں

اثر کا مصرعِ رنگیں پسندِ طبعِ حسرت ہے
قیامت ہے نہاں ان کے تبسّم ہائے پنہاں میں

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکّر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ترے ترکِ محبّت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مِٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ حسن کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں اِن خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرتؔ خام کاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

کسی عنوان صبر آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو
الٰہی کیا کروں اس خاطرِ محوِ تمنّا کو

نہ تھی واقف جو میرے اشتیاقِ بے نہایت سے
نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اس نگاہِ بے محابا کو

وہ خوابِ ناز میں تھے اور نہ تھے اے شوقِ پابوسی
نہ سمجھی پستیِ ہمّت تری اس لطفِ ایما کو

تمہیں بھی یاد ہوگا وہ زمانہ عیشِ ماضی کا
تمنّا چاہتی ہے پھر اسی لطفِ شناسا کو

بھر آئے اشک دور افتادگانِ بزمِ ساقی کے
مئے رنگیں سے خالی دیکھ کر آغوشِ مینا کو

نگاہِ شوق میں چمکا دیا ہے اور بھی ظالم
ترے ظلمِ نمایاں نے ترے حسنِ خود آرا کو

عیاں سب حال ہو جاتا ہماری بے قراری کا
وہ خود بھی دیکھ سکتے کاش اپنے نازِ یکتا کو

چھپائے سے کہیں آثار چھپتے ہیں محبت کے
نہ دو الزام میرے اضطرابِ آشکارا کو

گزاری عمر شغلِ عاشقی میں مرحبا حسرت
نہ پاس آنے دیا غم ہائے بے پایانِ دنیا کو

دلجوئی اغیار سے فرصت نہیں تم کو
معلوم ہوا قدرِ محبت نہیں تم کو

مٹ جائیں گے اس شیوۂ بیباک پہ لاکھوں
مارا ہے مجھے اور ندامت نہیں تم کو

بھولے ہی سے اُٹھ جائے نقابِ رُخِ زیبا
کیا شوق کی اتنی بھی رعایت نہیں تم کو

کچھ غیر نہیں ہم کہ بگڑ جائیں جفا سے
اظہارِ مراعات کی حاجت نہیں تم کو

ڈرتے نہیں رسوائیِ عقبیٰ سے بھی حسرت
دُنیا میں تو پروائے ملامت نہیں تم کو

قابو میں نہیں ہے دلِ شیدائے مدینہ
کب دیکھئے بر آئے تمنائے مدینہ

خوشبوئے رسالت سے ہے ازبسکہ معطّر
ق ہر ذرۂ آبادی و صحرائے مدینہ

ہے بے خودیٔ عشقِ حقیقی کا شناسا
ہر دل کہ ہے مخمور تولائے مدینہ

آتی ہے جو ہر شے سے یہاں اُن کی خوشبو
دنیائے محبت ہے کہ دنیائے مدینہ

ہے شام اگر گیسوئے احمد کی سیاہی
تو نورِ خدا صبحِ دلارائے مدینہ

اے وہ کہ سرورِ ابدی کا ہے طلبگار
پی ساغرِ دل سے مئے مینائے مدینہ

ڈر غلبۂ اعدا سے نہ حسرت کہ ہے نزدیک
فرمائیں مدد سیدِ والائے مدینہ

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خُدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فروغ کی خواہش
وہ اُن کے دردِ محبّت سے ساز باز کرے

اُمیدّ وار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی
اے یار تیرا حسنِ شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر (ق)
نورِ سحر کی وُہ لاجوابی

پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت اُن کی وہ نیم خوابی

بزمِ طرب ہی وہ بزم کیوں ہو
ہم غمزدوں کو واں باریابی

اس نازنیں نے باوصفِ عصمت (ق)
کی وصل کی شب وُہ بے حجابی

شوق اپنی بھولا گستاخ دستی
دل ساری شوخی حاضر جوابی

وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی

اس قیدِ غم پر قربان حسرتؔ
عالی جنابی گردوں رکابی

دل کو تری دُزدیدہ نظر لے کے گئی ہے
اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے

اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبّت
آئینِ وفا مدنظر لے کے گئی ہے

جب لے کے گئی ہے ہمیں تا کوئے ملامت
مجبوریِ دل خاک بسر لے کے گئی ہے

پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہو کہ دُعا کو
قسمت مری محروم اثر لے کے گئی ہے

اللہ رے کافر ترے اِس حُسن کی مستی
جو زلف تری تا بہ کمر لے کے گئی ہے

مغموم نہ ہو خاطرِ حسرتؔ کہ تلک تک
پیغامِ وفا بادِ سحر لے کے گئی ہے

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مُشقّت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

دشوار ہے رندوں پر انکارِ کرم یکسر
اے ساقیٔ جاں پرور کچھ لُطف و عنایت بھی

دل بسکہ ہے دیوانہ اُس حُسنِ گلابی کا
رنگیں ہے اسی رُو سے شاید غم فرقت بھی

خود عشق کی گُستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی
اے حُسنِ حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی
بادل جو نظر آئے بدلی مری نیّت بھی

ہیں شادؔ و صفیؔ شاعر یا شوقؔ و وفاؔ حسرتؔ
پھر ضامنؔ و محشرؔ ہیں اقبالؔ بھی وحشتؔ بھی

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے
تم یہ تو خوب کارِ پسندیدہ کر چلے

مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے
بیدار سارے فتنۂ خوابیدہ کر چلے

اظہارِ التفات کے پردے میں اور بھی
وہ عقدہ ہائے شوق کو پیچیدہ کر چلے

ہم بےخودوں سے چھپ نہ سکا رازِ آرزو
سب ان سے عرضِ حالِ دلِ دیدہ کر چلے

یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرتؔ سے مل کے وہ
کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

اربابِ اشتیاق سے پروا نہ چاہیے
اے حسنِ خود نما تجھے ایسا نہ چاہیے

ان کا ستم بھی عینِ کرم ہے خواص کو
اس کا مگر عوام میں چرچا نہ چاہیے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں
اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہیے

جو دیکھتے ہوں دیکھنے والوں کا دیکھنا
ایسوں کو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا نہ چاہیے

اتنی سی شے کا تم سے تقاضہ کریگا کون
دل لیکے ہم سے آنکھ چرانا نہ چاہیے

اخفائے عشق مدِ نظر ہو تو حسن سے
اظہارِ آرزو میں محابا نہ چاہیے

حسرتؔ کی طرح اور بھی مشتاق ہیں بہت
اس حسنِ بے مثال کو چھپنا نہ چاہیے

اثر تیرے تغافل کا رقیبِ کامراں تک ہے
وجودِ رشک یعنی اضطرابِ بدگماں تک ہے

ابھی دیکھی نہیں گستاخیاں جوشِ تمنا کی
تمہاری کم نگاہی التماسِ بے زباں تک ہے

چمن میں دورِ فصلِ گل ہے لیکن وائے محرومی
قیامِ بلبلِ مجبور رحمِ باغباں تک ہے

دلِ بیتاب کی بیباکیاں ان سے یہ کہتی ہیں
ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپکی شوخی کہاں تک ہے

مری مجبوریاں مشقِ جفا سے باز رکھیں گی
ترا شوقِ ستم ظالم خیالِ امتحاں تک ہے

سکھا دے گی ندامت شیوۂ قدرِ وفا اُن کو
یہ شانِ کج ادائی میری جانِ ناتواں تک ہے

مجھے طوفِ حرم کی آرزو، کیوں ہو، گذر میرا
سرِ کوئے بتاں تک ہے درِ پیرِ مغاں تک ہے

وہی جورِ خزاں ہوگا وہی محرومیاں ہونگی
نشاطِ بلبلِ بیدل بہارِ بوستاں تک ہے

ہماری داستانِ بے قراری بھی سُنا دیجو
گذر تیرا تو اے بادِ صبا اُنکے مکاں تک ہے

کہاں سے آئیں گی نیرنگیاں ترکیبِ مومن کی
یہ لُطفِ خوش بیانی حسرتِ رنگیں بیاں تک ہے

اُس نازنیں سے ہم کو جتنے گزند پہنچے
سب دل پذیر پہنچے سب دلپسند پہنچے

عالم ہی اب نہیں وہ تفریحِ بے خلل کا
محفل میں تیری ناحق ہم دردمند پہنچے

دل پر گذر گئی کچھ، لب تک جبھی تو آخر
آہیں بھی چند پہنچیں نالے بھی چند پہنچے

بیتابیوں نے آخر دعوائے صبر توڑا
پہنچے لبوں پہ نالے گو بند بند پہنچے

کس کو نہیں تمنا اس بزمِ جاں فزا کی
نزدیک ہے کہ دل بھی ہو کر سپند پہنچے

با وصفِ نارسائی تا ملکِ یاس حسرت
نالے ہمارے پہنچے اور سربلند پہنچے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا اُنکی عیادت کے مزے

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہے

ترے رُوئے دلارا کے تصوّر کا یہ عالم تھا
کہ چشمِ شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے

مرے اصرارِ مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرارِ آساں سے ترا انکار پیدا ہے

طریقِ عشقِ جاناں ہے جدا گبر و مسلماں کا
یہیں سے اختلافِ سبحہ و زنّار پیدا ہے

نگاہِ آرزو گلچینِ باغِ کامرانی ہے
بشانِ خواب شکلِ طالعِ بیدار پیدا ہے

وفا میری بہ شکلِ بے زبانی آشکارا تھی
ستم تیرا برنگِ پرسشِ اغیار پیدا ہے

نسیمِ دہلوی کی پیروی آساں نہیں حسرتؔ
تجھی سے ہے کہ یہ نیرنگیٔ گفتار پیدا ہے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

یاد بھی دل کو نہیں صبر و سکوں کی صورت
جب سے اس ساعدِ سیمیں کو کھلا دیکھا ہے

پھر اسی لطف ستم کوش کا مشتاق ہے دل
ہم نے جس لطف کو ہم رنگِ جفا دیکھا ہے

تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی
یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرتؔ
نگہہ شوق نے کیا جانئے کیا دیکھا ہے

محبوبیٔ و رنگینی ہیں جزوِ بدن تیری
سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

مجبورِ وفا کر کے محرومِ کرم کرنا
بھولیں گی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری

باطن میں وہ بے مہری ظاہر میں یہ دلجوئی
ہم خوب سمجھتے ہیں ترکیبِ سخن تیری

غارت گرِ تمکیں ہے آشوبِ دل و دیں ہے
یہ طرزِ نکو تیرا، یہ وضعِ حسن تیری

جو ہم سے چھپائی تھیں، ہم کو نہ بتائی تھیں
روشن ہیں وہ سب ہم پر باتیں من و عن تیری

اب رونے سے کیا ہوگا پروانہ ہے بے پروا
برباد ہے سب محنت اے شمع لگن تیری

اس شاہدِ رعنا کے اکرامِ اقامت سے
تقدیر چمک اٹھی اے ملکِ دکن تیری

تنہائیٔ غربت سے مغموم نہ ہو حسرت
کب تک نہ خبر لیں گے یارانِ وطن تیری

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

بھلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری
تری تمکینِ بیجا کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

جفائے یار کے شکوے نہ کر، اے رنجِ ناکامی
امید و یاس دونوں ہوں بہم ایسا بھی ہوتا ہے

مرے پاسِ وفا کی بدگمانی ہے بجا تم سے
کہیں بے وجہ اظہارِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے

تری دلداریوں سے صورتِ بیگانگی نکلی
خوشی ایسی بھی ہوتی ہے الم ایسا بھی ہوتا ہے

وقارِ صبر کھویا گریہ ہائے بیقراری نے
کہیں اے اعتبارِ چشمِ نم ایسا بھی ہوتا ہے

بہ دعوائے وفا کیوں شکوہ سنجِ جور ہے حسرت
دیارِ شوق میں اے محوِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

دل کی جو ترکِ عشق سے حالت بدل گئی — وہ بے خودی اوج خسرمی بے خلل گئی

تجھ کو فلک نے مجھ سے چھڑایا تو کیا ہوا — کیا تیری یاد بھی مرے دل سے نکل گئی

آہ اس سے نارسا ہی جو رہتی تو خوب تھا — کیوں اس حریمِ عیش میں یوں بے محل گئی

سودا ہی وہ نہیں ہے جو سر سے چلا گیا — حسرت ہی وہ نہیں ہے جو دل سے نکل گئی

آہ اس نگاہِ مست کی شوخی جو بے خبر — خوبی پہ روئے یار کے پہلے پہل گئی

رنگینیوں کی جان ہے وہ پائے ناز نیں — میری نگاہِ شوق جہاں سر کے بل گئی

حسرت یہ دورِ جہل ہے دولت کو ہے فروغ — اب ہم سے قدردانیٔ علم و عمل گئی

جو وہ نظر بسرِ لطف عام ہو جائے — عجب نہیں کہ ہمارا ابھی کام ہو جائے

شرابِ شوق کی قیمت ہے نقد جانِ عزیز — اگر یہ باعثِ کیفِ دوام ہو جائے

رہینِ یاس رہیں اہلِ آرزو کب تک — کبھی تو آپ کا دربار عام ہو جائے

جو اور کچھ ہو تری دید کے سوا منظور — تو مجھ پہ خواہشِ جنت حرام ہو جائے

وہ دور ہی سے ہمیں دیکھ لیں یہی ہے بہت — مگر قبول ہمارا اسلام ہو جائے

سنا ہے بر سرِ بخشش ہے آج پیرِ مغاں — ہمیں بھی کاش عطا کوئی جام ہو جائے

ترے کرم پہ ہے موقوف کامرانیٔ شوق — یہ ناتمام الٰہی تمام ہو جائے

عطا ہو سوز وہ یارب جنونِ حسرت کو — کہ جس سے پختہ یہ سودائے خام ہو جائے

حصّہ دُوم

از

سنہ ۱۹۱۲ء تا سنہ ۱۹۱۶ء

شرف حاصل ہے اس جانِ جہاں سے مجھ کو نسبت کا
غلامی کا سہی گر ہو نہ سکتا ہو محبّت کا

گروہِ عاشقاں میں جوش ہے شوقِ زیارت کا
ترے کوچے میں اک ہنگامہ برپا ہے محبّت کا

گنہگارانِ اُمت سے ہے راضی زاورِ محشر
کہ اُن سے نام چمکے گا ترے حُسنِ شفاعت کا

جبین و چشم و لب میں تیرے اک گنجینہ پنہاں ہے
صباحت کا ملاحت کا لطافت کا نظامت کا

دیارِ عاشقی میں گرم ہے بازارِ رسوائی
جدھر دیکھو اُدھر اک ڈھیر ہے جنسِ ملامت کا

قیامت اک نہاں ہے تیری آنکھوں میں شرارت کی
عبث دعویٰ ہے تیرے حُسنِ خود بیں کو متانت کا

گنہگاروں کا بیڑا پار ہو جاتے گا محشر میں
جو آیا جوشِ غفاری میں دریا اُن کی رحمت کا

وہ چشمِ سرمہ سا اک کان ہے گویا ملاحت کی
وہ روئے روشن اک گلزار ہے گویا صباحت کا

غضب تھی عشق کے جذبات گوناگوں کی رنگینی
دلِ حسرت بھی اک نیرنگ ہے رازِ محبّت کا

جفائے یار پر چھایا ہے اک عالم ندامت کا
یہی تھا مُدّعا میری تمنّائے شہادت کا

وہ میرے قتل ہی کو آئیں لیکن سامنے آئیں
نتیجہ کچھ تو نکلے جذبِ تاثیرِ محبّت کا

مرے ہر فعلِ مضطر سے ہے اِک شانِ جنوں پیدا
نمایاں ہے مری ہر بات میں اک رنگ وحشت کا

یہاں تو اک نئی آباد ہے دُنیا محبّت کی
کوئی اندازہ کیا کرتا دلِ عاشق کی وسعت کا

ہے لفظِ عشق میں اک داستانِ رنج وغم پنہاں
مرا قصّہ ابھی محتاج ہے شرح وصراحت کا

ترے عشاق نے ناکام ہو کر کامِ جاں پایا
ذریعہ بن گئی مایوسی بے حد فراغت کا

وہ کہتے ہیں کہ یہ بیمارِ غم ہے بچ نہیں سکتا
کیا ہے خوب اندازہ اُنھوں نے میری حالت کا

میں خود مجبور ہوں اس دل کے ہاتھوں کیا کروں حسرت
نشانہ سب مجھے ناحق بناتے ہیں ملامت کا

تجھ پہ گرویدہ اک زمانہ رہا
کچھ فقط میں ہی مُبتلا نہ رہا

جب سے تو مدعائے شوق رہا
پھر کوئی اور مُدّعا نہ رہا

آپ کو اب ہوئی ہے قدرِ وفا
جب کہ میں لائقِ جفا نہ رہا

جلد سُن لی مرے خدا نے مری
صبر کو شکوۂ دُعا نہ رہا

راہ و رسمِ وفا وہ بھول گئے
اب ہمیں بھی کوئی گِلا نہ رہا

حسن خود ہو گیا غریب نواز
عشق محتاجِ التجا نہ رہا

میں کبھی تجھ سے بدگماں نہ ہُوا
تو کبھی مجھ سے آشنا نہ رہا

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں
آپ کی یاد کے سوا نہ رہا

اور بھی ہو گئے وہ غافلِ خواب — نالۂ صبح نارسا نہ رہا
عشق جب شکوہ سنجِ حسن ہوا — التجا ہو گئی گلا نہ رہا
ہم بھروسے پہ اُن کے بیٹھ رہے — جب کسی کا بھی آسرا نہ رہا
آرزو تیری برقرار رہے — دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا
ہو گئے ختم مجھ پہ جورِ فلک — اب کوئی موردِ بلا نہ رہا
جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر — نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

نہ کچھ فکرِ جہاں رکھی نہ کچھ خوفِ سفر رکھا — خیالِ یار نے دل کو یہاں تک بےخبر رکھا
بجاں منظور ہے جو کچھ سزا ہو جرمِ الفت کی — کہ ہم نے فیصلہ اس بات کا بھی آپ پر رکھا
قناعت کی بدولت غایتِ بے احتیاجی نے — فقیری میں بھی ہم کو بے نیازِ اہلِ زر رکھا
ملا ساقی جو دریا دل بلانوشوں کی بن آئی — اٹھایا شام سے ساغر تو ہنگامِ سحر رکھا
چلے ہیں ان کی جانب ہو کے بیخود کیا خبر ہم کو — کہ ہم نے پاؤں مستی میں کہاں ڈالا کدھر رکھا
وہ تم ہو یا تمہارا درد ہو کوئی ہو دنیا میں — کیا جس سے تعلق ہم نے پیدا عمر بھر رکھا
غرض یہ تھی نہ ہو اہلِ ہوس کو میلِ غمِ حسرت — نہالِ عشق کو ظاہر میں حق نے بے ثمر رکھا

تر گریۂ حسرت سے ہے دورانِ تمنا — مجھ سا بھی نہ ہو کوئی پشیمانِ تمنا
ناکامیِ پیہم سے جو ٹوٹا دلِ عاشق — سب چھوٹ گئے قیدیِ زندانِ تمنا

پھر تازہ ہوا جوشِ جنوں فصلِ گُل آئی
پھر شوق ہوا سلسلہ جنبانِ تمنا

پھر سر ہے مرا اور وہی سودائے محبت
پھر دل ہے مرا اور وہی طوفانِ تمنا

گلگوں نہ ہوئیں اشکِ ندامت سے وہ آنکھیں
بے صرف ہوا خونِ شہیدانِ تمنا

اُمید ہی اُمید میں رہ جائے نہ حسرت
یوں ہی نہ گزر جائے یہ دورانِ تمنا

جذبِ کامل کو اثر اپنا دکھا دینا تھا
میرے پہلو میں انھیں لا کے بٹھا دینا تھا

کچھ تو دینا تھا ہمیں تیرے تغافل کا جواب
باخدا ان کے تجھے دل سے بھُلا دینا تھا

تم جو افسردہ ہوئے سن کے مرا حال سو کیوں
سرسری طور سے باتوں میں اُڑا دینا تھا

طائرِ جاں کے سوا کس کو بناتے قاصد
اس ستمگار کو پیغامِ قضا دینا تھا

رنجشِ بازوئے ناوک کی ضرورت کیا تھی
مجھ کو اک جنبشِ ابرو سے مٹا دینا تھا

دردِ محتاجِ دوا ہو یہ ستم ہے یارب
جب دیا تھا تو کچھ اس سے بھی سوا دینا تھا

وہ جو بگڑے تو خفا تم بھی ہوئے کیوں حسرت
پائے نخوت پہ سرِ شوق جھکا دینا تھا

مایوس نہ یوں ہوتے تو دور اگر ہوتا
ہم کچھ نہ تجھے کہتے مجبور اگر ہوتا

تھا شوقِ نظر کامل پھر بھی تو نہ چھپ سکتا
سو پردوں میں وہ جلوہ مستور اگر ہوتا

تاریک نہ یوں رہتی تقدیرِ سیہ مستی
شیشہ مئے گلگوں سے پُر نور اگر ہوتا

جب میں نے وفا کی تھی وہ کیوں نہ وفا کرتے
ایسا ہی محبت کا دستور اگر ہوتا

پاس اور نہ تھا اپنے کچھ بڑھ کے دل و جاں سے — ہم وہ بھی فدا کرتے مقدور اگر ہوتا
ظاہر میں جفا کرتے باطن میں وفا ہوتی — سو ڈھب سے کرم ہوتا منظور اگر ہوتا
کچھ دادِ وفا حسرت ہم کو نہ ملی ملتی — دُنیا میں یہ افسانہ مشہور اگر ہوتا

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا — ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی — شادیٔ مرگ کا بہا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر — ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
تیرے اس التفات کا ہوں غلام — جو ہوا بھی تو برملا نہ ہوا
حسن کی شان سادگی سے بڑھی — طرۂ زلف گردوتا نہ ہوا
کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ — تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا
روبرو ان کے کچھ نہیں معلوم — کیا ہوا بیخودی میں کیا نہ ہوا
خم کے خم غیر لے گئے ساقی — ہم کو اک جام بھی عطا نہ ہوا
حیف ہے اس کی بادشاہی پر — تیرے کوچے کا جو گدا نہ ہوا
مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج — یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا
ڈر گیا اس نگاہِ برہم سے — دل کو یارائے التجا نہ ہوا
جب تلک میرے دل میں جان رہی — دردِ مایوسِ مرحبا نہ ہوا

مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد — وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا
قانعِ رنجِ عشق تھا حسرتؔ — عیشِ دُنیا سے آشنا نہ ہوا

یوں تو عاشق ترا زمانہ ہوا — مجھ سا جانباز دوسرا نہ ہوا
خود بخود بوئے یار پھیل گئی — کوئی مِنّت کشِ صبا نہ ہوا
میں گرفتارِ الفتِ صیّاد — دام سے چھُوٹ کے بھی رہا نہ ہوا
ہجر میں جانِ مضطرب کو سکوں — آپ کی یاد کے سِوا نہ ہوا
رہ گئی تیرے فقرِ عشق کی شرم — میں جو محتاجِ اغنیا نہ ہوا
خبر اِس بے خبر کی لا دیتی — تجھ سے اتنا بھی اے صبا نہ ہوا
اُن سے عرضِ کرم تو کیا کرتے — ہم سے خود شکوۂ جفا نہ ہوا
ہو کے بے خود کلامِ حسرتؔ سے — آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

شک انھیں مجھ پہ کاروانی کا — کچھ ٹھکانا ہے بدگمانی کا
اک مُرقع ہے حسُنِ شوخ ترا — کشمکش ہائے نوجوانی کا
تم جو کرتے تو ہم کو تھا کافی — اک اشارہ بھی مہربانی کا
میں وہ محرومِ عشق ہوں جو ہے — منتظر مرگِ ناگہانی کا
بے نیازی سے تیری مل نہ سکا — کچھ صلہ میری جانفشانی کا

کھل گیا ہے ترے جمال سے رنگ — تیرے ملبوس ارغوانی کا
ناوکِ یار سے ہے دل میں بپا — ایک ہنگامہ شادمانی کا
لٹ کے ہم کو ہے اب خطر نہ خیال — رہزنی کا نہ پاسبانی کا
نہ سنو تم کہ میں نشانہ رہا — کن بلاہائے آسمانی کا
کون لے عرضِ حال کر کے عذاب — جان پر اُن کی سرگرانی کا
سچ تو یہ ہے کہ شعر حسرتؔ بھی — ایک گنجینہ ہے معانی کا

ہر لحظہ ہے تصور اے رشکِ حور تیرا — آنکھوں میں نور تیرا دل میں سرور تیرا
فریادِ غم نہیں ہے میری دعائے مضطر — اب نام بھی نہ لوں کیا میں ناصبور تیرا
دنیائے عاشقی میں ہر دم رہے مبارک — مجھ کو خشوع میرا۔ تجھ کو غرور تیرا
بیباکی عدو سے ناحق ہے بدگماں دل — جب دشمنِ ہوس ہے حسنِ غیور تیرا
محفل میں ان سے کی ہوں گستاخیاں کسی نے — پر وہ یہی کہیں گے سب ہے قصور تیرا
بیتاب دل کے ہاتھوں کیوں اے اسیرِ الفت — پھر اس گلی میں جانا ٹھہرا ضرور تیرا
کاہے کو رشکِ دل کی اب انتہا رہے گی — شہرہ پہنچ گیا ہے جب دور دور تیرا
رکھ لے مری بھی یارب شرمِ گناہگاری — ہے پردہ پوشِ عصیاں رحمِ غفور تیرا
کر کے وہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی ہے — روشن ہے ہم پہ حسرتؔ عزمِ امور تیرا

شکوۂ عشق جو ہم سے کسی عنواں نہ ہوا حشر میں بھی وہ جفا کار پشیماں نہ ہوا
کامیابی نہ ہوئی اہلِ نظر کو بھی نصیب روئے خورشید ہوا، وہ رُخِ تاباں نہ ہوا
دشمنِ زہد رہے حسنِ بتاں کے بندے کفرِ اُلفت پہ کبھی غلبۂ ایماں نہ ہوا
شکوۂ جور کا دیتے ہو تغافل سے جواب دشمنی یہ تو ہوئی مجھ پہ کچھ احساں نہ ہوا
وصل سے شوق کی شورش نہ ہوئی کم حسرت ہے یہ وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہوا

جاں کو صبر ہے نہ دل کو ہے تاب تو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب
دانشِ ہرزہ کوش ہے ناکام عشق درکار ہے ورائے حجاب
ہجرِ ساقی میں گریۂ سحری خوب ہو گا بجائے شغلِ شراب
دیکھئے دل پہ کیا بناتا ہے تیری فرقت میں یہ ہجومِ سحاب
مرمٹیں آرزوئے یار میں ہم ہے یہی عاشقی کا لُبِّ لباب
چشمِ رنداں سے روزِ ابر ہوئی ہجرِ ساقی میں بارشِ خونناب
میکدے میں ہے اک بپا حسرت محشرِ نائے و نوش و چنگ و رباب

میری طینت میں ہے داخل ہوسِ جامِ شراب بندۂ پیرِ مغاں ہوں میں خسِ جامِ شراب
نشۂ مے سے بڑھے شوق کی مستی ساقی نظرِ لطف بھی اک ہو جو پسِ جامِ شراب
فلکِ عیش پہ دم بھر میں گیا شخصِ دماغ کس غضب کا تھا سبک رو فرسِ جامِ شراب

ہم کہ اک قطرۂ مے کو بھی ترستے ہیں مدام
ہم سے قسمت میں ہے بڑھکر مگس جامِ شراب

قبضۂ مینا سے نہ مے چھلکے بھی آئی مجھ تک
حائل اک اور بھی حادۂ قفسِ جامِ شراب

مے سے محروم کہاں تک رہے پیمانۂ مے
تجھ سے فریاد ہے اے دادرسِ جامِ شراب

ہے تو موجود مگر پی نہیں سکتے حسرتؔ
بن گیا ہے غمِ دوریِ عسس جامِ شراب

فرقت میں تیری ہیچ ہے شانِ شبِ برات
اک آگ سی لگی ہے بجانِ شبِ برات

کچھ طرفہ دردِ دل کی فراہم ہیں لذتیں
ہوتا ہے شامِ غم پہ گمانِ شبِ برات

حیراں نہ میری بھول پہ ہوں خفتگانِ خاک
مجبور خود ہوں میں بہ زمانِ شبِ برات

کچھ شوقِ حرب و ضرب کا باقی تو ہے نشاں
گویا کہ سودِ جاں ہے زیانِ شبِ برات

حسرتؔ شنیدنی ہے مرے سوزِ غم کا حال
دورانِ ہجر میں بہ زبانِ شبِ برات

وہ بگڑے بہت بدگمانی کے باعث
نہ تڑپے جو ہم ناتوانی کے باعث

خفا آپ کیوں ہیں خطا میری کیا ہے
کھلیں کچھ تو اس سرگرانی کے باعث

میں بے دل ہوں ناحق کہ مجبور ہیں وہ
ستم کیشیٔ نوجوانی کے باعث

نہ سمجھو ہمیں حال پر اپنے راضی
کہ ہم چپ ہیں آزردہ جانی کے باعث

ملے کھل کے وہ مثلِ بیگانہ حسرتؔ
ہم اچھے رہے بے زبانی کے باعث

تسکینِ مدعا کے لئے اک دوا ہے تلخ
ظاہر میں گرچہ وہ سخنِ آشنا ہے تلخ

شیرینیٔ مراد نتیجہ ہے صبر کا
ہر چند اس ثمر کا بظاہر مزا ہے تلخ

مرغوبِ جاں ہیں شوق کی ایذا نصیبیاں
شیریں ہے کام یاس کہ زہرِ فنا ہے تلخ

اظہارِ لطفِ یار پہ اے دل نہ جائیو
میٹھا یہ ابتدا ہی میں ہے انتہا ہے تلخ

حسرت گراں ہے خلق پہ گو سہل ہے نماز
بدلا ہے اُن کے منہ کا مزا یوں غذا ہے تلخ

شکن جب سے دیکھی ہے اُن کی جبیں پر
عجب صدمہ ہے جانِ اندوہگیں پر

نہ چھوٹے گی اب دخترِ رز ہم سے ساقی
کریں گے عمل تیری رائے زریں پر

یہ جانیں ہیں عشاق کی یا ہے افشاں
پڑی ہے جو اس گیسوئے عنبریں پر

عجب اس کی خوشبو ہے کچھ رُوح پرور
وہ پوششِ جو تھی اُس تنِ نازنیں پر

نہ کرنا صبا ضبطِ غم کی نصیحت
کہ ہے صبر دشوار جانِ حزیں پر

بہت ہم نے ڈھونڈا مگر مثل تیرا
نہ پایا کہیں اور رُوئے زمیں پر

مرے گریۂ خوں کی سب لالہ کاری
نمودار ہے دامنِ آستیں پر

ہوئی اس میں اک گرمیٔ شوق پیدا
پڑی جو نظر اُس رُخِ آتشیں پر

تماشائے خوباں سے اتنا تغافل
صد افسوس اس زہد خلوت نشیں پر

نثار اس پہ حسرت مری جانِ شیریں
تبسّم جو ہے اس لبِ شکّریں پر

میں مبتلائے رنجِ وطن ہوں وطن سے دور
بلبل کے دل میں یادِ چمن ہے چمن سے دور

آشفتہ کس قدر ہے پریشان کسقدر
دل ہے جو اُسکی زلفِ شکن در شکن سے دور

ہے ہجر بھی وصال زہے خوبیٔ خیال
بیٹھے ہیں انجمن میں تری انجمن سے دور

سب یاد ہیں فریبِ محبت کے واقعات
اب دل رہے گا اِس نگہۂ سحرِ فن سے دور

فرقت میں اُن کی بوئے گل اے بادِ نوبہار
آئے بھی تو رہے مرے بیت الحزن سے دور

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

غالب کی طرح رہ گئی حسرت مری بھی شرم
مارا دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور

نہ کر بزمِ ساقی میں انکار واعظ
بگڑ جائیں گے رند مے خوار واعظ

ملامت نہ کر دیکھ لے کار واعظ
کہ ہے ترکِ مے ہم سے دشوار واعظ

نہ قائل ہوئے تھے نہ ہونگے نہیں ہم
بڑھاتا ہے ناحق کو تکرار واعظ

نہ اُلجھے گا پھر ہم خراباتیوں سے
اگر کچھ بھی ہوگا سمجھدار واعظ

یہ ظاہر کا سب زہد و تقویٰ ہے حسرت
حقیقت میں یاروں کا ہے یار واعظ

وہ تو کر دیں مرا قصور معاف
میں ہی کہتا نہیں حضور معاف

حشر میں بھی نہ ہوگا واعظ کا
گنہ آرزوئے حور معاف

حد نہیں ہے مرے گناہوں کی
پھر بھی کر دے جو وہ غفور معاف

میں ہوں تیری جفا سے بھی راضی — شکوۂ عقلِ بے شعور معاف
سادگی ہم گناہ گاروں کی — سب کرا لائے گی قصور معاف
ہو فرو کچھ تو انتظار کی آگ — گریۂ شوقِ ناصبور معاف
میں نے اقبال جرمِ عشق کیا — اور انھوں نے کیا ضرور معاف
کیا کرے تو خطائے شوق پہ رحم — نہ کرے جب ترا غرور معاف
اُن کے قدموں پہ گر بھی جا حسرتؔ — یوں نہ ہوگا ترا قصور معاف

کیوں نہ ہو اپنے اشتیاق میں فرق — آگیا آپ کے مذاق میں فرق
مجھ سیہ بخت کے لیے نہ رہا — روزِ ہجر و شبِ فراق میں فرق
تم جو ہم سے ملے تو وہ بھی ملا — نہ ہوا غیر کے نفاق میں فرق
ہو گیا ہم میں اِن میں فرق مگر — نہ ہوا شوق و اشتیاق میں فرق
یاد رہنے لگی تری ہر دم — آگیا صدمۂ فراق میں فرق
جب ملے وہ، ملی نظر سے نظر — نہ پڑا حسنِ اتفاق میں فرق
وہ جفاکار اور وفا حسرتؔ — تیرے اب تک نہیں مراق میں فرق

دل تیری طلب میں رہے بیتاب کہاں تک — اے بے خبر اے دشمنِ احباب کہاں تک
اب میں ہوں خنک جلوۂ مہتاب کا خواہاں — نظارۂ خورشید جہاں تاب کہاں تک

ہے کب سے جھپائے جفا گردشِ گردوں ۔ بیدار ہو اے محوِ طرب خواب کہاں تک
ہٹنے سے رہیں شوق کی بیباک نگاہیں ۔ شرمائے گی وہ نرگسِ سیراب کہاں تک
محروم ہے اب تک ترے دیدار سے حسرت ۔ آنکھوں کی یہ پابندیِ آداب کہاں تک

قوی دل شادماں دل پارسا دل ۔ ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل
لگا دو آگ عذرِ مصلحت کو ۔ کہ ہے بیزار اس شے سے مرا دل
جفا کاری ہے تسلیمِ ستم بھی ۔ نہ ہوگا تابعِ جور و جفا دل
لگا کر آنکھ اس جانِ جہاں سے ۔ نہ ہوگا اب کسی سے آشنا دل
مٹے افکارِ گوناگوں کے جھگڑے ۔ ترے غم کو نہ دے کیونکر دعا دل
بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت ۔ بڑی امید ہے میری بڑا دل

کیا ہی شرمندہ چلے ہیں دلِ مجبور سے ہم ۔ آئے تھے اُن کی زیارت کو بڑی دور سے ہم
دیکھنا ایک نظر بھی انھیں ٹھیرا ہے گناہ ۔ درخورِ عفو ہیں واقف نہ تھے دستور سے ہم
اس کے غمخوار بنے کیا کہ ہوئے خود بھی خراب ۔ کاش مانوس نہ ہوتے دلِ رنجور سے ہم
یاد میں تیری نہ دنیا ہی سے بیزار تھا دل ۔ خلد میں بھی تو مخاطب نہ ہوئے حور سے ہم
ربطِ باہم کی ہو کیا شکل، کہ آگاہ نہیں ۔ دلِ رنجور سے تم خاطرِ مسرور سے ہم
غلبۂ یاس نے اس درجہ ڈرایا ہے کہ اب ۔ دُور ہی بھاگتے ہیں عیش کے مذکور سے ہم

حسرت آئے گی تسلی کو یہاں رُوحِ شمیم[۵۱]
قید ہو آئے ہیں جھانسی جو للت پور سے ہم

جفا کو وفا سمجھیں کب تک بھلا ہم
اب ایسے بھی اُن کے نہیں مبتلا ہم

عجب ہیں یہ راز و نیازِ محبّت
خفا کیوں ہوئے وہ ہیں اس پر خفا ہم

نہ شیریں و لیلیٰ نہ فرہاد و مجنوں
زمانے میں اب ایک یا تم ہو یا ہم

یہ کیا منصفی ہے کہ محفل میں تیری
کسی کا بھی ہو جرم پائیں سزا ہم

ترے جور کا ہے تقاضہ کہ دیکھیں
ابھی کچھ دنوں اور راہِ قضا ہم

غریبوں سے کہتی ہے رحمت یہ اُن کی
کہ ہیں بے نواؤں کے حاجت روا ہم

تری راہ میں مرمٹیں بھی تو کیا ہے
فنا ہو کے پائیں گے عیشِ بقا ہم

تری خوئے بر ہم سے واقف تھے پھر بھی
ہوئے مفت شرمندۂ التجا ہم

اسیری میں ہو، یا فقیری میں حسرت
بہر حال ڈھونڈیں گے اُن کی رضا ہم

ہم سے ہو پیروی حق کا سرانجام کہاں
دیکھیں اس صبحِ صداقت کی ہو اب شام کہاں

عشق میں صبر و سکوں اے دلِ ناکام کہاں
اس دلآرام کی خواہش ہے تو آرام کہاں

ترکِ آداب کا عشّاق سے بیجا ہے گلہ
جب نہ ہو موردِ الزام تو الزام کہاں

کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے اس میں
نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں

حسرتِ زار ہے اور کشمکشِ یاس و اُمید
اب وہ بالیدگیِ شوق کا ہنگام کہاں

---

[۵۱] عبداللہ خاں شمیم

کیسے چھپاؤں رازِ غم، دیدۂ تر کو کیا کروں
دل کی تپش کو کیا کہوں سوزِ جگر کو کیا کروں

غیر ہیں گرچہ ہمنشیں بزم میں ہے تو وہ حسیں
پھر مجھے لے چلا وہیں ذوقِ نظر کو کیا کروں

غم کا نہ دل میں ہو گزر وصل کی شب ہو یوں بسر
سب یہ قبول ہے مگر خوفِ سحر کو کیا کروں

حال مرا تھا جب بتر تب تو ہوئے نہ تم خبر
بعد مرے ہوا اثر اب میں اثر کو کیا کروں

دل کی ہوس مٹا تو دی ان کی جھلک دکھا تو دی
پر یہ کہو کہ شوق کی "بارِ دگر" کو کیا کروں

شورشِ عاشقی کہاں اور مری سادگی کہاں
حسن کو تیرے کیا کہوں اپنی نظر کو کیا کروں

حسرتِ نغز گو ترا کوئی نہ قدرداں ملا
اب یہ بتا کہ میں ترے عرضِ ہنر کو کیا کروں

اُن کو دیکھوں یہ مجھ میں تاب کہاں
لے چلا ہے دلِ خراب کہاں

عارضِ بے خودی ہے رنجِ خمار
اب وہ بدمستیِ شراب کہاں

چھوڑ دوں عفوِ حق پہ فکرِ گناہ
مجھ سے ہوتا ہے یہ حساب کہاں

حشر و پشتارۂ ثواب کا بار
میں کہاں اور یہ عذاب کہاں

تھا جو مرغوبِ عاشقی حسرت
اب وہ ہنگامِ اضطراب کہاں

حُسنِ بے مہر کو پروائے تمنّا کیا ہو
جب ہو ایسا تو علاجِ دلِ شیدا کیا ہو

کثرتِ حُسن کی یہ شان نہ دیکھی نہ سُنی
برق لرزاں ہے کوئی گرمِ تماشا کیا ہو

بے مثالی کے ہیں یہ رنگ جو باوصف حجاب
بے نقابی پہ ترا جلوۂ یکتا کیا ہو

دیکھیں ہم بھی جو ترے حسنِ دلآرا کی بہار
اس میں نقصان ترا اے گلِ رعنا کیا ہو

ہم غرض مند کہاں مرتبۂ عشق کہاں
ہم کو سمجھیں وہ ہوس کار تو بیجا کیا ہو

دلفریبی ہے تری باعثِ صد جوش و خروش
حال یہ ہو تو دلِ زار شکیبا کیا ہو

رات دن رہنے لگی اس ستم ایجاد کی یاد
حسرتؔ اب دیکھیے انجام ہمارا کیا ہو

سر پہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو
کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

دانشِ بخت ہے بیدانشیٔ شوق کا نام
لوگ دیوانہ نہ سمجھیں ترے دیوانے کو

بھول جاؤں میں انھیں ہو نہیں سکتا ناصح
آگ لگ جائیو ظالم ترے سمجھانے کو

دیکھ لیں شمع کو تاثیرِ وفا کے منکر
جل بجھی خود بھی جلایا تھا جو پروانے کو

ہو کے سیراب کرم دل سے دعا دوں ساقی
ایک بار اور بھی بھر دے مرے پیمانے کو

فرقتِ یار میں گھنگھور اٹھی ہے جو گھٹا
اشکِ خوں آنکھ بھی آمادہ ہے برسانے کو

دل یہ کہتا ہے میں ہوں دردِ محبت کا غلام
جس نے آباد کیا ہے مرے ویرانے کو

روح کہتی ہے مری جان ہے وہ نورِ جمال
کر دیا جس نے منور مرے کاشانے کو

برقؔ کا قول مجھے یاد ہے اب تک حسرتؔ
زندگی کہتے ہیں دنیا سے گزر جانے کو

کامرانی تجھے مبارک ہو
جاودانی تجھے مبارک ہو

اے ترا غم دلوں کو وجہ سرور
شادمانی تجھے مبارک ہو

جاں فشانی مجھے نصیب رہے
دل ستانی تجھے مبارک ہو

ہجر میں یادِ یار کی اے دل
میہمانی تجھے مبارک ہو

مرقدِ عاشقاں پہ آخر کار
گل فشانی تجھے مبارک ہو

باہزاراں جمال و حسنِ کمال
نوجوانی تجھے مبارک ہو

جامِ اوّل وہ پی کے خود بولے
جامِ ثانی تجھے مبارک ہو

ہم غریبوں کی خستہ حالی پر
مہربانی تجھے مبارک ہو

نکتہ سنجانِ عصر کی حسرت
قدردانی تجھے مبارک ہو

روز و شب رویا کیے شام و سحر رویا کیے
رونے والے تیرے تجھ کو عمر بھر رویا کیے

بیوفائی سب سے کر کے تو نے دی دادِ وفا
تیری اس ہمّت پہ تیرے نوحہ گر رویا کیے

خام کاری میں بھی تیری وضعداری کا تھا رنگ
یعنی ہم اس سے بھی کر کے درگزر رویا کیے

کچھ خبر ہے تجھ کو اے آسودۂ خوابِ لحد
شب جو تیری یاد میں ہم تا سحر رویا کیے

تیرے جیتے جی نہ جانی قدر تیری اے عزیز
اپنی اس تقصیر پر ہم کس قدر رویا کیے

جانِ محزون و دلِ پر غم کی حالت کیا کہوں
یاد کچھ کر کر کے جو باہم دگر رویا کیے

برق کے مرنے کا حسرت واقعہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ! اگر ہم عمر بھر رویا کیے

ہر حال میں ناشادیِ دل یاد رہے گی
پابندیِ حرمانِ خداداد رہے گی

بیکار ڈراتے ہیں مجھے قیدِ ستم سے
واں روحِ وفا اور بھی آزاد رہے گی

معمورِ غمِ عشق عجب دل کی ہے بستی
ہرچند اجاڑو اُسے آباد رہے گی

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار
ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

نسبت جزو کل کی ہے یہ دنیائے عمل میں
اقوام کو محتاجیِ افراد رہے گی

گھبرا کے کہا رُوح نے زندانِ جسد میں
کب تک ابھی اس قید کی میعاد رہے گی

میں ہوں وہ رضا جو کہ طبیعت مری حسرت
ناکامیِ جاوید سے بھی شاد رہے گی

وہ عرضِ وصل پہ بگڑے حجاب کے بدلے
نگاہِ ناز نے پہلو عتاب کے بدلے

اگر ہوا بھی تو الٹا اثر دُعا میں ہوا
سکونِ یاس ملا اضطراب کے بدلے

خدا کی شان فقیروں کی یاد آئی تمہیں
کرم کیا ستمِ اجتناب کے بدلے

شبِ وصال شبِ ماہ گر نہیں تو نہ ہو
اک آفتاب جو ہے ماہتاب کے بدلے

وہ بے نقاب ہوئے بھی تو کیا ہوا کہ رہے
ہجومِ حُسن کے پردے نقاب کے بدلے

بلائے جاں ہیں شہیدوں کو تیرے حُور و قصور
یہ کیا عذاب ملا ہے ثواب کے بدلے

فریب سب ہیں یہ آغازِ عشق کے حسرت
وہ لیں گے اس کرمِ بے حساب کے بدلے

غمِ زمانہ سے دل کو فراغ باقی ہے
ہنوز ان کی محبّت کا داغ باقی ہے

نہ عیش کا نہ کچھ اربابِ عیش کا ہے پتہ
نہ خانہ باغ نہ تفریحِ باغ باقی ہے

مسافرانِ فنا کے نشانِ پا سے ہنوز — مقامِ اہلِ وفا کا سراغ باقی ہے
عبث ہیں سب یہ تقاضے ترے نسیمِ بہار — یہاں کسے ہوسِ باغ و راغ باقی ہے
نہیں ہے قدر زمانے میں لحنِ بلبل کی — ہنوز غلغلۂ بوم و زاغ باقی ہے
وہ ایک بار جو سونگھی تھی زلفِ یار کی بو — سو روح آج تلک تر دماغ باقی ہے
دلِ فسردۂ حسرت میں اب وہ بات کہاں — شرابِ جوش کا خالی ایاغ باقی ہے

بہت خجل ہے ترے درد سے دعا میری — یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری
ہوئی ہے عشق میں عزت پسِ فنا میری — کرامتیں ہیں جو مشہور جا بجا میری
جدھر کو اب وہ چلاتے وہی ہے راہِ مراد — رضائے یار سے وابستہ ہے رضا میری
چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی — وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری
کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف — کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری
نہ کیوں ہو عشق میں دعوائے امتیاز مجھے — کہ جورِ حسن سے منسوب ہے وفا میری
وہ بگڑے بیٹھے ہیں اس پر کہ ہم کو کیوں چاہا — ہوئی بھی گر تو یہ ثابت ہوئی خطا میری
کبھی چرا کے جو روزن سے بھی تجھے دیکھوں — تو جور کی جو سزا ہو وہی سزا میری
وصالِ یار کی منزل قریب ہے حسرت — ہوئی ہے آرزوئے شوق رہنما میری

ان کو نہ کوئی سمجھے بیداد نہیں کرتے — ہم جور کے خوگر ہیں فریاد نہیں کرتے

...لوادو، آخر یہ ادا کیا ہے
انکار نہیں ہوتا، ارشاد نہیں کرتے

سرپیشِ ستم اپنا ہرگز نہ فرو ہوگا
اس کارِ غلاماں کو آزاد نہیں کرتے

اس پر بھی کچھ ایسا ہے راضی ہیں بہم دونوں
ہم شاد نہیں ہوتے تم شاد نہیں کرتے

رُوح اُن کی حقیقت میں ویرانِ فراغت ہے
جو دل کو ترے غم سے آباد نہیں کرتے

کب سے درِ دولت پر ہوں منتظرِ رحمت
کچھ آپ مرے حق میں ارشاد نہیں کرتے

کر وقفِ بُتاں حسرتؔ ناحق نہ خلوص اپنا
اس جنسِ گرامی کو برباد نہیں کرتے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا ترا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونہ دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے، وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پاتا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رُو رُو کے مجھ کو بھی رُلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اُڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مُدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

پردے سے اِک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

گم کردہ راہِ عشق فنا کیوں نہ ہو گیا
احساں جو اس پہ خضر و مسیحا کے رہ گئے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

جب عاشقوں سے صدمۂ ہجراں نہ اُٹھ سکا
آخر کو ایک روز وہ سم کھا کے رہ گئے

جب وہ چھٹا تو کچھ نہ رہا دل میں اک مگر
داغِ فراق اُس گلِ رعنا کے رہ گئے

ملنے کی اُن سے ایک بھی صُورت نہ بن پڑی
سارے مسوّدے دلِ دانا کے رہ گئے

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں
کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے

بے باک تھا زبسکہ مرا اضطرابِ شوق
شرما کے وہ کبھی، کبھی جھُنجھلا کے رہ گئے

دل کی لگی بجھا بھی وہ سکتے تو بات تھی
یہ کیا ہوا کہ آگ ہی بھڑکا کے رہ گئے

آتے بھی وہ چلے بھی گئے وہ مثالِ برق
دل ہی میں حوصلے دلِ شیدا کے رہ گئے

کیا دل میں آگئی جو زراہِ کمالِ رحم
دعویٰ وہ میرے قتل کا فرما کے رہ گئے

پہلے تو خون میرا بہایا خوشی خوشی
پھر کیا وہ خود ہی سوچ کہ پچھتا کے رہ گئے

دعویٰ عاشقی ہے تو حسرتؔ کرو نباہ
یہ کیا کہ ابتدا ہی میں گھبرا کے رہ گئے

حُور و غلماں پہ کیوں فدا ہوتے
اہلِ ظاہر جو پارسا ہوتے

کچھ بھی ہوتا جو اختیار اپنا
تجھ سے کاہے کو ہم جُدا ہوتے

شوق کو اِتّقا سے کیا نسبت
رند ہوتے نہ ہم تو کیا ہوتے

کس قدر سہل ہے حصولِ بقا
دیر لگتی نہیں فنا ہوتے

ہم کو ہوتی نہ خرمی کی ہوس
گر ترے غم سے آشنا ہوتے

تم لگاتے جو اپنے ہاتھ سے تیغ
سب مرے زخم دل کشا ہوتے

حالِ دل اُن سے کیوں کہا حسرتؔ
تم نہ کہتے نہ وہ خفا ہوتے

حصّہ سوم

از

سنہ ۱۹۱۶ء تا سنہ ۱۹۱۷ء

بام پر آنے لگے وہ، سامنا ہونے لگا
اب تو اظہارِ محبّت برملا ہونے لگا

عشق سے پھر خطرۂ ترکِ وفا ہونے لگا
پھر فریبِ حسن سرگرمِ ادا ہونے لگا

کیا کہا میں نے جو ناحق تم خفا ہونے لگے
کچھ سنا بھی یا کہ یوں ہی فیصلہ ہونے لگا

یاد پھر اس بے وفا کی ہر گھڑی رہنے لگی
پھر اسی کا تذکرہ صبح و مسا ہونے لگا

شوق کی بیتابیاں حد سے گزر جانے لگیں
وصل کی شب وا جو وہ بندِ قبا ہونے لگا

غیر سے مل کر انھیں ناحق ہوا میرا خیال
مجھ سے کیا مطلب بھلا میں کیوں خفا ہونے لگا

کیا ہوا حسرتؔ وہ تیرا ادعائے ضبطِ غم
دو ہی دن میں رنجِ فرقت کا گلا ہونے لگا

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

کی یاس سے ہوس نے لڑائی تمام شب
تم نے تو خوب راہ دکھائی تمام شب

پھر بھی تو ختم ہو نہ سکی آرزو کی بات
ہر چند ہم نے اُن کو سنائی تمام شب

بیباک ملتے ہی جو ہوتے ہم تو شرم سے
آنکھ اُس پری نے پھر نہ ملائی تمام شب

دل خوب جانتا ہے کہ تم کس خیال سے
کرتے رہے عدو کی بُرائی تمام شب

پھر شام ہی سے کیوں وہ چلے تھے چھڑا کے ہاتھ
دکھتی رہی جو اُن کی کلائی تمام شب

حسرت سے کچھ وہ آتے ہی ایسے ہوئے خفا
پھر ہو سکی نہ اُن سے صفائی تمام شب

باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظر بند
ہے دیدۂ دل وا نہ یہاں دیدۂ سر بند

بیگانۂ تفصیل ہیں لب ہائے شکایت
جب سے کہ ہوئی کشورِ حرماں کی نظر بند

فریاد کو دل کی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچے
گویا ہے دعاؤں پہ مری بابِ اثر بند

نیند اُن کی اڑی جاتی ہے باش اے دلِ نالاں
کیا اب بھی نہ ہوگا یہ ترا وردِ سحر بند

اس غم طلبی کی بھی کوئی حد ہے کہ حسرت
بے چین ہوئے ہم جو ہوا دردِ جگر بند

شوقِ جفائے یار کو پاسِ وفا سے کیا غرض
ہم کہ رضا شعار ہیں ہم کو دعا سے کیا غرض

عاشقِ دل فگار کو، بے خود و بے قرار کو
محوِ لقائے یار کو، شوقِ لقا سے کیا غرض

چارۂ دردِ دل ہو کیوں انکی جفا خجل ہو کیوں
عشق بھی منفعل ہو کیوں، مجھکو شفا سے کیا غرض

تجھ پہ نثار جی کریں، شوق کی پیروی کریں
تو جو کہے وہی کریں، ہم کو ابا سے کیا غرض

حسرتِ مے پرست کو بلکہ ہر ایک مست کو
پیرِ مغاں کے دور میں خوفِ خطا سے کیا غرض

اب دیکھئے کیا حال ہمارا ہو سحر تک — بھڑکی ہوئی اک آگ سی ہے دل سے جگر تک

مانا کہ یقینی ہے اثر جذبۂ دل کا — کیا ہوگا مگر ہجر میں تائیدِ اثر تک

میں بے خبرِ غم تھا، مگر وہ دمِ رخصت — دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حدِّ نظر تک

اَب تک نہ مٹے ہم سے وہ حالانکہ ابھی میں — لیلائے شبِ وصل کی زلف آئی کمر تک

کچھ محوِ تصوّر تھا میں اس درجہ کہ حسرت — مجھ کو نہ ہوئی یار کے آنے کی خبر تک

ہر دل میں اک ہجومِ محبت ہے آج کل — اس شوخ کی کچھ اور ہی صورت ہے آج کل

اے سحرِ حسنِ یار میں اب تجھ سے کیا کہوں — دل کا جو حال تیری بدولت ہے آج کل

مستور کس حجاب میں ہے وہ جمالِ پاک — اہلِ نظر کو جس سے عقیدت ہے آج کل

اک طرفہ بیخودی کا ہے عالم کہ عشق میں — تکلیف آج کل ہے نہ راحت ہے آج کل

ساقی سے فصلِ گل میں کریں کیوں سوالِ مے — کیا التماس کی بھی ضرورت ہے آج کل

حسرت وہ سوزِ خاص جو ہو حاصلِ فراق — تیرے سخن میں اسکی بھی لذّت ہے آج کل

اس تغافل پر بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم — کتنے ہیں مجبور دیکھو او بانیٔ بیداد ہم

عقل کب آئی ہمیں جب ہو چکا ناکام دل — رحم کب آیا انھیں جب ہو چکے برباد ہم

آئے تھے محفل میں تیری باہزاراں آرزو — یا چلے ہیں ایک لے کر خاطرِ ناشاد ہم

ہر طرف پیشِ نظر ہے وہ جمالِ دلفریب — دیکھتے ہیں یوں بہارِ گلشنِ ایجاد ہم

قیدِ تنہائی میں بھی تنہا نہیں اے یادِ یار! / آج یہ عقدہ کھلا ہم پر کہ ہیں آزاد ہم
مار ڈالا مجھ کو حسرتؔ یونہی جب اُس نے کہا / ماننا ہوگا تجھے کرتے ہیں جو ارشاد ہم

ہم پر تری نگاہ جو پہلے تھی اب نہیں / سو بھی نہ کچھ دنوں میں رہے تو عجب نہیں
صادق نہیں وہ عشق جسے از رہِ نیاز / منظورِ نازِ حسن کا پاسِ ادب نہیں
تھے بسکہ دل پذیر محبّت کے واقعات / کچھ کچھ وہ اب بھی یاد مجھے ہیں جو سب نہیں
مسرورِ یادِ یار ہے، کیا تیری سادگی / اے دل یہ شامِ ہجر ہے عشرت کی شب نہیں
کیونکر کہوں نہیں انھیں پروائے عاشقاں / کیا حسنِ مہوشاں بھی تماشا طلب نہیں
کیوں عشق میں ابھی سے نہ ہو جائیں ہم فنا / کیا جانئے کہ موت کب آتی ہے کب نہیں
حسرتؔ جفائے یار تو اک عام تھی ادا / اظہارِ التفات مگر بے سبب نہیں

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں / جلد اے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں
بزمِ ساقی کا یہ کیا حال ہوا میرے بعد / خم کہیں ہے تو صراحی ہے کہیں جام کہیں
آہ کہنا وہ ترا پا کے مجھے گرمِ نظر / ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انداز ہے کیا / قصد اُن کا کہیں جانے کا ہے پیغام کہیں
رنجِ بے سود ہے حاصل ہو یونہی کاش نجات / مار ہی ڈالے ہمیں وہ بتِ خود کام کہیں
مجھ کو مشتاقِ لقا جان کے کہتا ہے وہ شوخ / بر نہ آئی ہو یہ تیری ہوسِ خام کہیں

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرتؔ
آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں
خراب گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں
فلکؔ وقار و ملک اقتدار ہم بھی ہیں
یہ فخر ہے کہ ترے خاکسار ہم بھی ہیں
دلِ ہوس جو نشانہ تری نظر کا ہوا
تو روحِ شوق پکاری شکار ہم بھی ہیں
اسی سے چھپتے ہیں ہوتی ہے جس پہ اُنکی نظر
اگر یہی ہے تو اُمیدوار ہم بھی ہیں
ہمیں کبھی شام سے ساقی نہیں ملی ہے شراب
ستم رسیدۂ رنجِ خمار ہم بھی ہیں
نگاہِ یار سے اظہارِ التفات ہوا
تو حالِ دل نے کہا آشکار ہم بھی ہیں
شکایت اُن کی نہ چاہو یہی کہو حسرتؔ
نشانۂ ستمِ روزگار ہم بھی ہیں

کیا حال سنائے دلِ رنجور کسی کو
ملنا ہی نہ ہو مجھ سے جو منظور کسی کو
آنکھوں سے وہ پنہاں ہے تو کیا دیدۂ دل سے
ہم دیکھتے رہتے ہیں بدستور کسی کو
کیا چیز ہے اس حسنِ فروزاں کی تجلّی
جو نار کسی کو ہے تو ہے نور کسی کو
مانا کہ رسا ہیں ترے نالے مگر اے دل
اتنا بھی نہیں کرتے ہیں مجبور کسی کو
اب صدمۂ ہجراں سے بھی ڈرتا نہیں کوئی
لے پہنچی ہے یاد اُنکی بہت دور کسی کو
خاطر ہی میں لاتا نہیں از راہِ تبختر
وہ شوخ وہ بے مہر وہ مغرور کسی کو
یوں بھول نہ جانا تھا اگر مدِ نظر تھی
تسکین دلِ حسرتِ رنجور کسی کو

کیوں جانِ رضا جو نہ شہادت پہ فدا ہو / کون اُس کو نہ چاہے گا بھلا تم جسے چاہو
دل غم سے جو کہتا ہے محبّت کا بُرا ہو / ایسے میں تری یاد کبھی آجائے تو کیا ہو
پاس آؤ تو کچھ دل کی تپش اور سوا ہو / ہر چند کہ تم دردِ جُدائی کی دوا ہو
دل ہم نے دیا آپ کو اب اِس کا نتیجہ / قسمت پہ ہے موقوف بُرا ہو کہ بھلا ہو
رنجِ شبِ غم میں کبھی ملے وصل کی راحت / گر دل میں ترے دردِ محبّت کا مزا ہو
مرتا ہے کسی شوخِ جفا کار پہ حسرت / شاید یہ فسانہ کہیں تم نے بھی سُنا ہو

گھٹے گا تیرے کوچے میں وقار آہستہ آہستہ / بڑھے گا عاشقی کا اعتبار آہستہ آہستہ
بہت نادم ہوئے آخر وہ میرے قتلِ ناحق پہ / ہوئی قدرِ وفا جب آشکار آہستہ آہستہ
جلائے شوق سے آئینۂ تصویرِ خاطر میں / نمایاں ہو چلا روئے نگار آہستہ آہستہ
محبّت کی جو پھیلی ہے یہ نکہت باغِ عالم میں / ہوئی ہے منتشر خوشبوئے یار آہستہ آہستہ
ملا کر خاک میں مجھ کو جھکی ہے شرم سے لیکن / اُٹھے گی پھر وہ چشمِ فتنہ کار آہستہ آہستہ
دل و جان و جگر صبر و خرد جو کچھ ہے پاس اپنے / یہ سب کر دیں گے ہم اُن پر نثار آہستہ آہستہ
عجب کچھ حال ہو جاتا ہے اپنا بیقراری سے / بجاتے ہیں کبھی جب وُہ ستار آہستہ آہستہ
اثر کچھ کچھ رہے گا وصل میں بھی رنجِ فرقت کا / دلِ مضطر کو آئے گا قرار آہستہ آہستہ
نہ آئیں گے وہ حسرت انتظارِ شوق میں یونہی / گذر جائیں گے ایامِ بہار آہستہ آہستہ

مستی کے پھر آگئے زمانے
آباد ہوئے شراب خانے

ہر پھول چمن میں زر بکف ہے
بانٹے ہیں بہار نے خزانے

سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے
چھیڑا جو لطیفہ صبا نے

سرسبز ہوا نہالِ غم بھی
پیدا وہ اثر کیا ہوا نے

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی
واعظ کے نہ چل سکے بہانے

کر دوں گا میں ہر ولی کو میخوار
توفیق جو دی مجھے خدا نے

دل زخمیٔ غم ہوا جگر بھی
اک تیر سے دو اُڑے نشانے

بیگانۂ مے کیا ہے مجھ کو
ساقی کی نگاہِ آشنا نے

ناحق انھیں کر دیا ہے برہم
بیتابیٔ شوق برملا نے

اب کاہے کو آئیں گے وہ حسرت
آغازِ جنوں کے پھر زمانے

خیالِ یار جو مصروفِ کار ہوتا ہے
قرار بخشِ دلِ بے قرار ہوتا ہے

انھیں سوال مرا ناگوار ہوتا ہے
مجھے خیال یہی بار بار ہوتا ہے

نگاہِ اہلِ تمنّا سے اُن کی محفل میں
خمارِ بے خبری آشکار ہوتا ہے

جنوں میں عقدہ یہ حیرانیٔ نظر سے کھلا
خیالِ محوِ تماشائے یار ہوتا ہے

وہی قلوب جو حرماں نصیب ہوتے ہیں
اُنھی میں شوق ترا بے شمار ہوتا ہے

یہ ماجرا بھی ہے دنیائے عاشقی میں نیا
کہ نامراد یہاں کامگار ہوتا ہے

سکونِ شوق کی صورت نکل چکی حسرتؔ — کہ دل کے ساتھ جگر بھی فگار ہوتا ہے

اِس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے — صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے

دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا — اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے

اس میں بھی مجھے شک ہے کہ ظاہر ہے بناوٹ — وہ شوخ جو غیروں سے خفا میرے لئے ہے

وہ حسن کے مالک ہیں جفا تھی انھیں جائز — میں بندۂ خوباں ہوں وفا میرے لئے ہے

پا کر مجھے بیکس تری رحمت یہ پکاری — یہ بندۂ بے برگ و نوا میرے لئے ہے

دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہے لیکن — کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے

ارباب ہوس تجھ سے ہوں نالاں تو میں خوش ہوں — جو ان کو سزا ہے وہ جزا میرے لئے ہے

کہتے ہیں وہ اب قدر ہوئی ہم کو وفا کی — گویا کہ یہ سب مدح و ثنا میرے لئے ہے

اِس گیسوئے برہم کی اُڑا لائی ہے نکہت — آوارگیٔ بادِ صبا میرے لئے ہے

اوروں پہ نوازش ہیں جو بیباک ہے حسرتؔ — قسمت سے وہ مجبورِ حیا میرے لئے ہے

تیرا کرم جو رِ نما میرے لئے ہے — یہ دردکہ ہے جانِ دوا میرے لئے ہے

پرسش جو ہوئی روزِ ازل قسمتِ غم کی — بیساختہ دل بول اٹھا میرے لئے ہے

میں اپنی مصیبت پہ ہوں نازاں کہ وہ خوش ہیں — مجھ سے کہ یہ پابندِ بلا میرے لئے ہے

غیروں سے کبھی ہے انھیں نفرت کبھی اُلفت — اِن دونوں سے اک بات جُدا میرے لئے ہے

ایسا تو نہ ہوگا کہ نہ پہنچوں ترے در تک
جب تیری کشش راہ نما میرے لئے ہے

جو بندۂ دنیا ہیں مبارک انھیں دنیا
میں دین کا پیرو ہوں خدا میرے لئے ہے

ہر حال میں ہوں خوش میں کہ ہر بات میں لازم
پابندئ تسلیم و رضا میرے لئے ہے

دیکھا تو کہا مجھ کو غمِ یار نے حسرت
یہ سوختۂ بے سر و پا میرے لئے ہے

اس چہرۂ انور کی ضیا میرے لئے ہے
وہ زلفِ سیہ تاب و دتا میرے لئے ہے

زنہار اگر اہلِ ہوس تجھ پہ فدا ہوں
یہ مرتبۂ صدق و صفا میرے لئے ہے

بن کر ہیں ریاکار جھیائے فنا ہوں
آوازۂ حق بانگِ درا میرے لئے ہے

خوشنودئ فجّار کے پیرو ہیں یزیدی
تقلیدِ شہِ کرب و بلا میرے لئے ہے

محروم ہوں مجبور ہوں بے تاب و تواں ہوں
مخصوص ترے غم کا مزا میرے لئے ہے

سرمایۂ راحت ہے فنا کی مجھے تلخی
اس زہر میں سامانِ بقا میرے لئے ہے

جنّت کی ہوس ہو تو ہیں کافر کہ پریشاں
اس شوخ کی خوشبوئے قبا میرے لئے ہے

پہلے بھی کچھ امیّد نہ تھی چارہ گروں کو
اور اب تو دوا ہے نہ دعا میرے لئے ہے

مر جاؤں گا میخانے سے نکلا جو کبھی میں
نظارۂ مے روح فزا میرے لئے ہے

تشخیص طبیباں پہ ہنسی آتی ہے حسرت
یہ دردِ جگر ہے کہ دوا میرے لئے ہے

عشق میں خوفِ جاں سے در گزرے
ہم نے ٹھانی جو دل میں کر گزرے

زندگی اپنی ہو کے اُن سے جدا — سخت گزرے گی، اب اگر گزرے
دل کی مایوسیوں سے اُن کے بغیر (ق) — رنج کیا کیا نہ جان پر گزرے
شامِ فرقت کٹے نہ ہجر کی رات — صبح گزرے نہ دوپہر گزرے
زندگی ہے اسی کا نام تو ہم — ایسی درماندگی سے درگزرے
اُن سے اظہارِ شوق کون کرے — جان ہی سے کوئی مگر گزرے
اُن کے قدموں پہ رکھ دیا سرِ شوق — ہم یہ کیا بیخودی میں کر گزرے
منتظر ہے متاعِ جاں حسرتؔ — کہ اِدھر بھی وہ فتنہ گر گزرے

زمانِ فصلِ گُل آیا نسیمِ مشکبار آئی — دلوں کو مژدہ ہو پھر جوشِ مستی کی بہار آئی
پھلا کھولا رہے گلزار یا رب حُسنِ خوباں کا — مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی
سرِ پُرشور بھی اک بار تھا جسکو مری گردن — ترے کوچے میں آج اے فتنۂ دوراں اتار آئی
تری محفل سے ہم آئے مگر باحالِ زار آئے — تماشا کامیاب آیا تمنّا بے قرار آئی
جو اُن کے حُسن سے بھی بڑھ گئی ہے بیقراری میں — تڑپ ایسی کہاں سے عشق میں پروردگار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے — ہوس نے کام جاں پایا محبّت شرمسار آئی
بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرتؔ — جو پھر بھی دل نوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی

شبِ فرقت میں یاد اس بے خبر کی بار بار آئی — بھلانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی

ترے فیضِ کرم سے دین کے دریا میں جوش آیا
ترے یمنِ قدم سے باغِ ایماں میں بہار آئی

تری محفل سے اے پیرِ مغانِ عاشقی اکثر
مشیخت نے نواز آئی فضیلت میگسار آئی

امیدیں تجھ سے تھیں وابستہ لاکھوں آرزو لیکن
بہت ہو کر تری درگاہ سے بے اعتبار آئی

الٰہی رنگ یہ کب تک رہیگا ہجرِ جاناں میں
کہ روزِ بےدلی گزرا تو شامِ انتظار آئی

تری بے اعتنائی کو یہ آخر کیا خیال آیا
جو میری پرسشِ غم کو بچشمِ اشکبار آئی

نہ ہاتھ آیا بجز رنج و بلا کچھ عشق حسرت کو
دیارِ حسن کی آب و ہوا ناسازگار آئی

بیجا ہے فصلِ گل میں اے دل یہ بے خروشی
مستانہ کیوں نہ گزرے ہنگامِ بادہ نوشی

میخانے بند رکھا مستانِ بے خبر کو
پیرِ مغاں نے یوں کی رندوں کی پردہ پوشی

آغازِ عاشقی تھا جوش و خروش یکسر
یا انتہائے غم ہے حیرانی و خموشی

دیدار کی طلب میں حد سے گزر چلی ہے
اپنی اُمیدواری اُن کی بہانہ کوشی

افسانہ ہو گئی ہے دنیائے مغفرت میں
تیری عطا شعاری میری خطا فروشی

ایسا بھی کیا تلوّن یار اپنے مائلوں سے
یا اتنی سرد مہری یا ویسی گرم جوشی

یوں کرتے ہیں جفا وہ اہلِ وفا پہ حسرت
رسمِ ستم ہے گویا، آئینِ حق نویسی

شورِ طفلاں چاہئے اے عشقِ سودائی مجھے
کیوں پسند آنے لگی صحرا کی تنہائی مجھے

اب تقاضہ ہے یہ اس حسنِ تماشا دوست کا
ہر نظر دیکھا کرے بن کر تماشائی مجھے

اپنی ہستی سے بھی آخر ہو گیا بیگانہ ہیں
ان سے جب جا کر ہوئی حاصل شناسائی مجھے

بھول کر شاید کبھی آجائے اُن کو بھی خیال
یوں پسند آئی ہے اِس کوچے کی رُسوائی مجھے

اور بھی حسرت وہ کچھ رہنے لگے ہیں محوِ ناز
جب سے جانا ہے اُنھوں نے اپنا شیدائی مجھے

کون یہ دست بہ شمشیر نظر آتا ہے
مجھ کو اک عالمِ تصویر نظر آتا ہے

جلوۂ حسن سے رنگیں دلِ پُر داغ مرا
شوق کے ہن ہیں کشمیر نظر آتا ہے

کم نگاہی میں بھی اِس محوِ حیا کی دل کو
اثرِ سُرمۂ تسخیر نظر آتا ہے

ولولے دل کے ترے غم کا ادب کیوں نہ کریں
اک جوانوں میں بھی پیر نظر آتا ہے

غیر سے ہنس کے وہ بولے مجھے پا کر بیباک
آج یہ طالبِ تعزیر نظر آتا ہے

اُن سے ملنے کی نکلتی نہیں تدبیر کوئی
کام وابستۂ تقدیر نظر آتا ہے

پاسکا بار نہ اس بزمِ طرب میں شاید
حسرت اس درجہ جو دلگیر نظر آتا ہے

حصّہ چہارم

از

اگست سنہ ۱۹۱۷ء تا اپریل سنہ ۱۹۱۸ء

کاہیکو دل اے عشق ترے غم سے بچے گا
اب ہم نہ بچائیں گے نہ یہ ہم سے بچے گا
لے لے گی دل اُن کے رُخِ روشن کی تجلّی
بالفرض جو اس گیسوئے پُرخم سے بچے گا
حسرت کوئی کتنا ہی چھُپائے کہ بچائے
دل ایک نہ اس فتنۂ عالم سے بچے گا

نظر پھر نہ کی اُس پہ، دل جس کا چھینا
محبّت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا
وہ کیا قدر جانیں دلِ عاشقاں کی
نہ عالم نہ فاضل نہ دانا نہ بینا
یہ کیا کفرِ نعمت ہے اے شیخ آخر
کہ برسات میں بھی پلانا نہ پینا
وہیں سے یہ آنسو رواں ہیں جو دل میں
تمنّا کا پوشیدہ ہے اک خزینا
بہادیں وہاں خون اپنا جہاں ہم
ترے حسن کا گرتے دیکھیں پسینا

یہ کیا قہر ہے ہم پہ یارب کہ بے مے
گزر جائے ساون کا یوں ہی مہینا

بہار آئی، سب شادماں ہیں مگر ہم
یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا

جدا جب کہ ہیں تجھ سے اے راحتِ جاں
ہمارا برابر ہے جینا نہ جینا

مٹے عیب سب عشق بازی میں حسرت
نہ بغض و حسد ہے، نہ غصہ نہ کینا

انھوں نے پھیر دیا خط یوں ہی سلام کے بعد
بڑھا کے میرا تخلص بھی میرے نام کے بعد

شراب رندوں میں آئی مہِ صیام کے بعد
بڑے تزک سے بڑی شان اہتمام کے بعد

ہجوم شوق میں کیوں ہو نہ اضطراب کے رنگ
کہ یاس شب ہے یقینی امید شام کے بعد

کمالِ شوق کو آتے ہیں نا تمامِ نظر
تمام شوق تری خواہشِ تمام کے بعد

نہ ہو ابھی، مگر آخر تو ہوگی قدر مری
کھلے گا حالِ غلام آپ پر غلام کے بعد

سرور بخش دل و جاں ہے بزمِ ساقی میں
بہارِ جلوۂ مینا نمودِ جام کے بعد

ہوئی یہ کثرتِ اربابِ اشتیاق۔ کہ اب
پڑے ہیں سوچ میں حسرت وہ اذنِ عام کے بعد

پوچھا بھی تو اس نے نہ کبھی گھر سے نکل کر
شرمندہ ہیں نالے دلِ مضطر سے نکل کر

پائی ہے جگہ پاکیٔ دامانِ نظر میں
خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر

کیا چیز تھی ساقی وہ پسِ پردۂ مینا
جو سرخ پری بن گئی ساغر سے نکل کر

دیکھا جو کہیں گرمِ نظر بزمِ عدو میں
وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

بن جاتی ہے دل میں خلشِ خارِ تمنّا
جھنکار ترے پاؤں کے زیور سے نکل کر

پُر نور کیا خوب شہیدوں کے دلوں کو
چاہت کی چمک نے ترے خنجر سے نکل کر

حسرتؔ مجھے بھاتی ہے پریشانیٔ دل بھی
آتی ہے جو اس گیسوئے ابتر سے نکل کر

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بیدلیٔ ہمرہاں سے ہم

کچھ ایسی دُور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جبکہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

اے یادِ یار دیکھ کہ باوصفِ رنجِ ہجر
مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم

معلوم سب ہے پوچھتے ہو پھر بھی مدّعا
اب تم سے دل کی بات کہیں کیا زباں سے ہم

اے زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے
سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم

بیتابیوں سے چھُپ نہ سکا حالِ آرزو
آخر بچے نہ اس نگہِ بدگماں سے ہم

حسرتؔ بھی اور جاکے کریں کس کی بندگی
اچھّا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں
اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں

مل کے اُن کی نگاہِ جادو سے
دل کو حیراں بنا گئیں آنکھیں

مجھ کو دکھلا کے راہ کوچۂ یار
کس غضب میں پھنسا گئیں آنکھیں

اس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے
دل میں گویا سما گئیں آنکھیں

محفلِ یار میں بذوقِ نگاہ
لُطف کیا کیا اُٹھا گئیں آنکھیں

حال سنتے وہ کیا مرا حسرت
وہ تو کہئے سُنا گئیں آنکھیں

خدا جانے یہ اپنا حال کیا ہے ہجرِ جاناں میں
کہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں

خموشی کی عجب یہ گفتگو ہے وصل میں باہم
نہ کہتے ہیں وہ کچھ ہم سے نہ ہم کچھ اُن سے کہتے ہیں

نہ دکھلائے خدا دشمن کو بھی دُوری کے یہ صدمے
جو ہم اُن سے بچھڑ کر آج کل مجبور سہتے ہیں

مقرر بے ادب ٹھہریں گے لیکن کیا کریں حسرت
رہا جاتا ہے حالِ دل اگر خاموش رہتے ہیں

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں

دیکھیئے شوقِ شہادت میں جھکی ہے گردن
آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں

اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنّا نہ کریں

میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرسش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھّا نہ کریں

دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں

شکوۂ جور تقاضائے کرم عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

نورِ جاں کیلئے کیوں ہم کسی کامل کی تلاش
ہم تری صورتِ زیبا کا تماشا نہ کریں

عشق اور حُسن سے بیزار ہو زنہار نہ ہو
ہم کبھی شکوہ کریں آپ کا حاشا نہ کریں

طالبِ کوثر و تسنیم جو ہوں حضرتِ شیخ
خواہشِ بادہ کی توہین گوارا نہ کریں

اب جو ملتی ہے تو چلّو ہی سے پی لیں مے نوش
انتظارِ طلبِ جام ہے بیجا نہ کریں

حال کھل جائے گا بیتابیٔ دل کا حسرتؔ
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

ان سے مل کر شکوۂ بے اعتنائی پھر کہاں
شادرہ اے دل کہ یہ لطفِ جدائی پھر کہاں

اب بھی ہیں اہل ہوس ناقدر دانِ شانِ حسن
لے چلا ہے ان کو شوقِ خودنمائی پھر کہاں

سب ہماری زندگی ہی تک ہیں اُن کے حوصلے
ورنہ یہ نازو غرورِ دل ربائی پھر کہاں

شوق ہو کامل تو کیسا جورِ خوباں کا گلا
باوفا ہم ہوں تو رنجِ بے وفائی پھر کہاں

تم ہو کیسے کوئی دنیا میں اگر اپنا نہیں
یعنی جب یہ ہے تو فکرِ بے نوائی پھر کہاں

شرط ہے اک بار پڑ جانا تمہارے عشق میں
اس طلسمِ غم سے امیدِ رہائی پھر کہاں

لوٹ لے جی بھر کے حسرتؔ لذتِ آغازِ عشق
اس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

سمجھ ہی میں نہیں آتا کچھ ایسے دلربا تم ہو
قیامت ہو غضب ہو قہر ہو آفت ہو کیا تم ہو

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کس کے دھوکے میں
کہ جب آخر مجھے دیکھا تو شرما کر کہا تم ہو

زمانے میں اگر کوئی نہیں اپنا تو کیا پروا
کسی سے کیا غرض مجھ کو کہ میرا آسرا تم ہو

رگِ جاں سے بھی ہو نزدیک لیکن وائے محرومی
ابھی تک جانتے ہیں سب یہی تم کو جدا تم ہو

ندامت کیوں نہ ہو حسرتؔ غرورِ بادشاہی کو
سمجھنا چاہیے تھا کس کے کوچے کے گدا تم ہو

گھر کے آخر آج برسی ہے گھٹا برسات کی
میکدوں میں کب سے ہوتی تھی دعا برسات کی

موجبِ سوز و سرور و باعثِ عیش و نشاط
تازگی بخشِ دل و جاں ہے ہوا برسات کی

شام سرما دل رُبا تھی صبحِ گرما خوش نما
دلرُبا تر، خوشنما تر ہے فضا برسات کی

گرمی و سردی کے مِٹ جاتے ہیں سب جس سے مرض
لال لال اک ایسی نکلی ہے دوا برسات کی

سُرخ پوشش پر ہے زرد و سبز بوٹوں کی بہار
کیوں نہ ہوں رنگینیاں تجھ پر فدا برسات کی

دیکھنے والے ہوئے جاتے ہیں پامالِ ہوس
دیکھکر چھب تیری اے رنگیں ادا برسات کی

لازم و ملزوم ہیں ابرِ تر و دامانِ تر
درخورِ رحمت ہے حسرتؔ یہ خطا برسات کی

ہمیں وقفِ غم سر بسر دیکھ لیتے
وہ تم کچھ نہ کرتے مگر دیکھ لیتے

نہ کرتے کبھی خواہشِ سیرِ جنّت
جو واعظ ترا رہ گزر دیکھ لیتے

رسائی کہاں بزمِ دشمن میں اپنی
کہ ہم بھی انھیں اک نظر دیکھ لیتے

تمنّا کو پھر کچھ شکایت نہ رہتی
جو تم بھول کر بھی ادھر دیکھ لیتے

نہ رہتی خبر دین و دُنیا کی حسرتؔ
جو سوتے انھیں بے خبر دیکھ لیتے

غزل گوئی رہی یکتا میانِ عاشقاں میری
کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری

شبِ غم کیا خبر دیتی ہیں پیہم ہچکیاں میری
خداوندا انھیں کیوں یاد آتی ناگہاں میری

مرا انکارِ جرمِ عاشقی سے کون مانے گا
کہ صاف اقرارِ غم کرتی ہے چشمِ خونفشاں میری

جہانِ حُسن میں جب تک رہیگا آپ کا شہرہ
زبانِ عشق پر جاری رہے گی داستاں میری

ہمارے شکوہ ہائے سخت جانی پر وہ کہتے ہیں
ابھی دیکھی نہیں ہے آپ نے تیغِ رواں میری

تمہارے جورِ بے پروا سے بھی اب چھپ نہیں سکتی
غمِ پنہاں کی شدت ہے جو حالت ہے عیاں میری

نہ جانے تھا وہ ایسا کیا مزا فکرِ محبت میں
کہ حسن کے نام پر مرتی ہے طبعِ شادماں میری

انھیں اب ناز ہے خود اپنی صورت پر کہ برسوں سے
پرستش کر رہا ہے حسرتِ رنگیں بیاں میری

ہر بات میں اک شان ہے بے ساختہ پن کی
تصویر ہے تقریر تری حسنِ سخن کی

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرین و سمن کی
لائی ہے چمن میں انھیں تقدیر چمن کی

فرقت میں یہ عالم ہے ترے خستہ دلوں کا
کچھ ہوش ہے تن کا نہ خبر کچھ ہے بدن کی

ہونٹوں پہ ہنسی رہتی ہے آنکھوں میں تبسم
سب ختم ہیں ان پر صفتیں خالقِ حسن کی

ہے آج یہ کیا بات کہ بے ساختہ حسرت
یاد آتی ہے رہ رہ کے عزیزانِ وطن کی

سرِ حشر ان سے پھر صاحب سلامت ہونے والی ہے
ابھی اک اور بھی برپا قیامت ہونے والی ہے

تمہارے حسن کی جو کچھ بھی شہرت ہونے والی ہے
جو سچ پوچھو تو میری ہی بدولت ہونے والی ہے

حجاب اس مست کی آنکھوں سے رخصت ہونے والا ہے
مجھے ہر بات کی حاصل اجازت ہونے والی ہے

دمِ آخر مجھے دیکھا تو نادم ہو کے فرمایا
کسے معلوم تھا تیری یہ حالت ہونے والی ہے

خدا جانے عدو سے مشورے کیا ہوتے رہتے ہیں
نئی شاید کوئی مجھ پر عنایت ہونے والی ہے

وہ از راہِ عطا مجھ پر کرم فرمانے والے ہیں
مری شامِ الم صبحِ مسرت ہونے والی ہے

تمنا کی بہت اچھی نہیں بیباکیاں حسرت
سُنا ہے اُن سے پھر تری شکایت ہونے والی ہے

نگاہِ اہلِ نظر میں وہ نور بن کے رہے
قلوبِ اہلِ ولا میں سرور بن کے رہے

عجب نہیں کہ ترے عاشقوں کو ہے جو نصیب
وہ انکسار بھی وجہِ غرور بن کے رہے

تری نوازشِ پیہم سے ڈر یہی ہے کہ دل
کچھ اور بھی نہ کہیں ناصبور بن کے رہے

کسی کے جور و تغافل ہیں بھی ہمارے لئے
مزے معانی بین السطور بن کے رہے

دیارِ حسن میں لے جا ہے کاروائیِ عشق
مزا تو جب ہے کہ یاں بےشعور بن کے رہے

وہ جس گناہ کو کہدیں ثواب، ہو وہ ثواب
جسے قصور بتادیں قصور بن کے رہے

تری طلب میں اذیت عزیز ہو کے رہی
تری تلاش میں زحمت سرور بن کے رہے

جنوں کا زور یہی ہے تو کیا عجب حسرت
کہ رفتہ رفتہ یہ شورِ نشور بن کے رہے

حصّہ پنجم

از

اپریل ۱۹۱۸ء تا اپریل ۱۹۲۲ء

دیکھنے کو آئے ہیں کوٹھے پہ وہ کالی گھٹا
جھومتی پھرتی ہے کیا کیا ہو کے متوالی گھٹا

آئی تھی لبریزِ غم ہو کر سوئے جورِ یار میں
خوب رُو رُو کر دل اپنا کر چلی خالی گھٹا

بندۂ غم ان کے بے فکرِ دو عالم ہو گئے
سب غلط سمجھے کہ عیشِ فارغ البالی گھٹا

بار بار آتی ہے گھِر گھِر کر جو قصرِ یار پر
بن گئی ہے کیا کسی کی چاہنے والی گھٹا

توبۂ حسرت کی خیر آئی تھی کاہے کو کبھی
اس قدر کالی گھٹا اس درجہ متوالی گھٹا

عشق اس کے عاصیوں کا اک نورِ تام نکلا
گویا سحابِ شب سے ماہِ تمام نکلا

عشاق منتظر کو یہ صبح تو مبارک
خورشید اک نرالا بالائے بام نکلا

محروم اک ہمیں ہیں اے مقصدِ تمنا
دنیا میں ورنہ کس کا تجھ سے نہ کام نکلا

کس درجہ جانفزا تھا نظارہ بزمِ مے کا
جب بعد صبح بینا خورشیدِ جام نکلا
وصلِ بتاں کی خواہش خوئے عوام ٹھہری
حسرتؔ خیالِ خوباں سودائے خام نکلا

انھیں بیوفائی کا شکوہ نہ ہوتا
خفا ہم نہ ہوتے تو اچھا نہ ہوتا
حسینوں میں قدر اپنی کاہے کو ہوتی
دلِ زار گر تجھ پہ شیدا نہ ہوتا
ہرے ہو گئے زخم سب آرزو کے
گلی میں تری کاش جانا نہ ہوتا
بگڑ کر وہ ملتے وہ من کر بگڑتے
نہ خود روٹھتے ہم تو کیا کیا نہ ہوتا
خفا کب ہو تم ان سے ہوتے تو حسرتؔ
جدائی کا اس درجہ صدمہ نہ ہوتا

کبھی کی تھی، جو اب دوا کیجئے گا
مجھے پوچھ کر آپ کیا کیجئے گا
مرے دعوئ بے نیازی کو سُن کر
ہنسے وہ کہ پھر التجا کیجئے گا
وہ شوخی سے کہتے ہیں کہئے تو مطلب
اشاروں میں کب تک ادا کیجئے گا
تغافل ہیں شانِ جفا پھر ہے شاید
محبت کی پھر ابتدا کیجئے گا
رقیبوں سے کب تک نہ ملئے گا صاحب
کہاں تک ہمارا کہا کیجئے گا
وہ کہنا ترا یاد ہے وقتِ رخصت
کبھی خط بھی ہم کو لکھا کیجئے گا
جوانی میں عشقِ بتاں بس ہے حسرتؔ
بڑھاپے میں یادِ خدا کیجئے گا

کفیل تھا کرمِ حق جو مے گساروں کا | ہجوم ہے لبِ کوثر گناہ گاروں کا
اِدھر تو آپ کے الطافِ بیکراں کی وہ دھوم | اُدھر یہ حال محبت کے دل فگاروں کا
یہ کیا ستم ہے کہ رہتا ہے ہر گھڑی مجمع | تری گلی میں تمنا کے شرمساروں کا
غرورِ حسن سے فرصت انھیں کہاں جو کبھی | سنیں وہ غور سے حال اپنے خاکساروں کا
نہ کر زبان کو آلودۂ شکایتِ دوست | کہ اے عزیز یہ شکوہ ہے خام کاروں کا
اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں | کلام دیکھ لیا سن لیا ہزاروں کا

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم | ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا | وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم
دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق | بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم
ہوئے محو کس کی تمنا میں ایسے | کہ مستغنیٔ ماسوا ہو گئے ہم
انھیں رنج اب کیوں ہوا ہم تو خوش ہیں | کہ مر کر شہیدِ وفا ہو گئے ہم
جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا | تو اِک پیکرِ التجا ہو گئے ہم
تری فکر کا مبتلا ہو گیا دل | مگر قیدِ غم سے رہا ہو گئے ہم
فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت | سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

پیشِ نظر جو وہ قمرِ خانگی نہیں | یہ جوشِ انتظار ہے دیوانگی نہیں

محفل میں دل کا حال چھپے کیا کہ شوق کو / اس نازنیں سے رخصتِ بیگانگی نہیں
بڑھ جائے گا غرور کچھ اور اُن کے رُوبرو / اظہارِ حالِ دل کوئی فرزانگی نہیں
غم ہائے دہر سے جو بری ہو وہی ہے مرد / حزن و ہراس شیوۂ مردانگی نہیں
ذوقِ شراب کیوں ہو مجھے چشمِ یار میں / پیمانگی نہیں ہے کہ مے خانگی نہیں
تم سے گدا کو اس شہِ خوباں کی آرزو / حسرتؔ یہ اور کیا ہے جو دیوانگی نہیں

عشقِ بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے / آخر یہ میں نے اپنا کیا حال کر لیا ہے
سنجیدہ بن کے بیٹھو اب کیوں نہ تم کہ پہلے / اچھی طرح سے مجھ کو پامال کر لیا ہے
نادم ہوں جان دے کر آنکھوں کو تو نے ظالم / رو رو کے بعد میرے کیوں لال کر لیا ہے
تعزیرِ دل میں اتنی شدّت نہ کر جب اُس نے / خود جرمِ عاشقی کا اقبال کر لیا ہے
کیا کیا ہے شوقِ نازاں حسرتؔ کہیں جو خوشبو / اُن کی جبینِ تر سے رومال کر لیا ہے

وہ جب یہ کہتے ہیں مجھ سے خطا ضرور ہوئی / میں بے قصور بھی کہہ دوں کہ ہاں حضور ہوئی
نظر کو تابِ تماشائے حسنِ یار کہاں / یہ اس غریب کو تنبیہہ بےقصور ہوئی
طفیلِ عشق ہے حسرتؔ یہ سب مرے نزدیک / ترے کمال کی شہرت جو دُور دُور ہوئی

حصۂ ششم

از

نومبر ۱۹۲۲ء تا ستمبر ۱۹۲۳ء

آئی جو اُن کی یاد مرا دل ٹھہر گیا
دعوئ غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا

تیرِ نگاہِ یار کا مشکل ہے سامنا
میرا ہی تھا جگر کہ مقابل ٹھہر گیا

ہم سر جھکا چکے تھے علم ہو چکی تھی تیغ
پھر کیا کیا خیال کہ قاتل ٹھہر گیا

دل خوش ہوا جو آپ ہوتے مائلِ ستم
یعنی میں التفات کے قابل ٹھہر گیا

دل کو ولائے یار پہ حاصل ہوا قیام
پایا جو اس جہاز نے ساحل ٹھہر گیا

خوابِ خیال ہو گئیں اگلی وہ صحبتیں
پھیرا ابھی اس نواح کا مشکل ٹھہر گیا

فرزانگی قصور ہے دنیائے عشق میں
دیوانہ جو ہوا وہی کامل ٹھہر گیا

بیچارگی میں رٹ جو لگی اُن کے نام کی
تسکین جانِ زار ہوئی دل ٹھہر گیا

اچھا ہوا کہ مملکتِ حسن و عشق میں
حسرتؔ وہ پادشاہ ہیں سائل ٹھہر گیا

چاندنی رات میں پھولوں کا ہے زیور کیا خوب
رنگ لائے گا ترا حسنِ معطر کیا خوب

روشنی بخش تمنّا ہے جو اک ماہِ منیر
وصل کی رات کا چمکا ہے مقدر کیا خوب

قابلِ دید تھی گرمی میں پسینے کی بہار
تر ہوا ہے عرقِ حسن سے بستر کیا خوب

دیکھتے ہی انھیں پہچان لیا جان لیا
ہم سے وہ چھپنے چلے تھے پسِ چادر کیا خوب

بن گئی ہے بدلِ گردشِ گردوں ساقی
ڈھونڈ لیتا ہے بہلنے دلِ مضطر کیا خوب

کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرت
گھیر لیتی ہے انھیں زلفِ مُعنبر کیا خوب

ان کو رسوا مجھے خراب نہ کر
اے دل اتنا بھی اضطراب نہ کر

آمدِ یار کی اُمید نہ چھوڑ
دیکھ اے آنکھ میلِ خواب نہ کر

دل ہی رہتی ہے مے پرست کو مے
فکرِ نایابیِٔ شراب نہ کر

ناصحا ہم کریں گے شرحِ جنوں
دلِ دیوانہ سے خطاب نہ کر

شوق یاروں کا بے شمار نہیں
ستم اے دوست بےحساب نہ کر

دل کو مستِ خیالِ یار بنا
لب کو آلودۂ شراب نہ کر

رکھ بہر حال شغلِ مے حسرت
اس میں پروائے شیخ و شاب نہ کر

ہر دردِ ہر مرض کی دوا ہے تمہارے پاس
آتے ہیں سب یہیں کہ شفا ہے تمہارے پاس

لایا ہے جذبِ دل جو انھیں کھینچ کر یہاں
وہ پوچھتے ہیں کیا یہ بلا ہے تمہارے پاس

پھیلائی ہے اسی نے مرے دردِ دل کی بات
غمّاز اک جو بادِ صبا ہے تمہارے پاس

کس کس خوشی سے ہو گئے لوگوں کے دل اسیر
کیا چیز دامِ زلف دوتا ہے تمہارے پاس

سمجھاؤ لاکھ دل کو پر آتا نہیں قرار
اس کا بھی کچھ علاج بھلا ہے تمہارے پاس

سب حل ہوں مشکلیں جو ملے دولتِ یقیں
لوحِ طلسمِ بیم و رجا ہے تمہارے پاس

کیونکر پہنچ سکے گی مرے حال کی خبر
کتنا ہجومِ ناز و ادا ہے تمہارے پاس

اقرار ہے کہ دل سے تمہیں چاہتے ہیں ہم
کچھ اس گناہ کی بھی سزا ہے تمہارے پاس

مارو کہ اب جلاؤ ہمیں تم، ہے اختیار
سر رشتۂ فنا و بقا ہے تمہارے پاس

اب کوئی کیا کرے دلِ گم گشتہ کی تلاش
سب کہتے ہیں یہی کہ سنا ہے تمہارے پاس

حسرت کرو نہ دل میں زیارت حضور کی
آئینہ رسول نما ہے تمہارے پاس

یہ کس بزم کے ہم نکالے ہوئے ہیں
کہ محرومیوں کے حوالے ہوئے ہیں

وہ اب آئینِ محفل ہیں، سب اہلِ محفل
خبردار ہیں دل سنبھالے ہوئے ہیں

فریبِ وفا آپ دیتے ہیں کس کو
یہ جلوے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں

وہ بے پردہ ہوتے ہیں، ظاہر میں لیکن
دوپٹہ یوں ہی منہ پہ ڈالے ہوئے ہیں

محبت کی خوشبو سے بدمست یکسر
تری شال تیرے دوشالے ہوئے ہیں

یہ کیا جانے زاہد کہ ہے آبِ رحمت
مرے جام تیرے کھنگالے ہوئے ہیں

ضیا بارئ عشقِ جاناں ہے حسرت
اندھیرے دلوں کے اجالے ہوئے ہیں

ہم دیر سے نظارۂ خوباں میں لگے ہیں
یہ پھول غضب گلبنِ ایماں میں لگے ہیں

مصروفِ غمِ عشق نہیں دل کے ارادے
قیدی ہیں کہ سب کام پہ زنداں میں لگے ہیں

ٹکڑے ہیں یہ کس کے دلِ محروم کے ظالم
اب تک جو ترے تیر کے پیکاں میں لگے ہیں

مجھ سے وہ کھلیں کیا کہ نظر اٹھ نہیں سکتی
محجوب ہیں پیرائشِ داماں میں لگے ہیں

لگتی ہی نہیں روضۂ رضواں میں طبیعت
اُن کی جو سرِ کوچۂ جاناں میں لگے ہیں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت
اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

اِس بُت کے پجاری ہیں مسلمان ہزاروں
بگڑے ہیں اسی کفر میں ایمان ہزاروں

دُنیا ہے کہ اُن کے رخِ گیسو پہ مٹی ہے
حیران ہزاروں ہیں پریشان ہزاروں

تنہائی میں بھی تیرے تصوّر کی بدولت
دل بستگیٔ غم کے ہیں سامان ہزاروں

اے شوق تری پستیٔ ہمّت کا بُرا ہو
مشکل ہوئے جو کام تھے آسان ہزاروں

آنکھوں نے تجھے دیکھ لیا اب انھیں کیا غم
حالانکہ ابھی دل کو ہیں ارمان ہزاروں

چھانے ہیں ترے عشق میں آشفتہ سری نے
دُنیائے مصیبت کے بیابان ہزاروں

اک بار تھا سر گردنِ حسرت پہ رہیں گے
قاتل تری شمشیر کے احسان ہزاروں

بیباک ہو پناہِ جفا ہے تمہارے ساتھ
ہر وقت عاشقوں کی قضا ہے تمہارے ساتھ

بیچارگی کے زور ہیں دورِ فراق میں
درد اپنے پاس ہے تو دوا ہے تمہارے ساتھ

عشاق پاکباز کے حلقے ہیں یا کوئی — انبوہ اہلِ صدق و صفا ہے تمہارے ساتھ
تم سے ملا جو کوئی وہ اپنا نہ رہ گیا — دل بھی جدا جگر بھی جُدا ہے تمہارے ساتھ
دل گیر کیوں ہو، غلبۂ اعدا سے دوستو — کیا ڈر تمہیں کہ فضلِ خدا ہے تمہارے ساتھ
رنگینیاں ہیں جلوۂ زیبائے حُسن کی — یا اک طلسم ہوش رُبا ہے تمہارے ساتھ
حسرتؔ نہیں جو خوف تمہیں کچھ بھی موت کا — یہ عشق ہے کہ آبِ بقا ہے تمہارے ساتھ

کیا کام انہیں پرسشِ اربابِ وفا سے — مرتا ہے تو مر جائے کوئی اُن کی بلا سے
مجھ سے بھی خفا ہو مری آہوں سے بھی برہم — تم بھی ہو عجب چیز کہ لڑتے ہو ہوا سے
دامن کو بچاتا ہے وہ کافر کہ مُبادا — چھُو جائے کہیں پاکیٔ خونِ شہدا سے
دیوانہ کیا ساقیٔ محفل نے سبھی کو — کوئی نہ بچا اس نظرِ ہوش رُبا سے
اک یہ بھی حقیقت میں ہے شانِ کرم اُن کی — ظاہر میں وہ رہتے ہیں جو ہر وقت خفا سے
آگاہِ غمِ عشق نہیں وہ شہِ خوباں — اور یہ بھی جو ہو جائے فقیروں کی دُعا سے
قائل ہوئے رندانِ خرابات کے حسرتؔ — جب کچھ نہ ملا ہم کو گروہِ عرفا سے

ہوتی ہے روز بارشِ عرفاں مرے لئے — گویا بہشتِ عشق ہے زنداں مرے لئے
ناکامیٔ طلب میں کہ ہے جانِ عاشقی — گنجینۂ مُراد ہے پنہاں مرے لئے
علم و رضائے یار سے جور و جفائے یار — مشکل ہے سب کے واسطے آساں مرے لئے

رہتی ہے روز اک ستمِ تازہ کی تلاش
بے چین ہے وہ فتنۂ دوراں مرے لئے

میرا یہ حسنِ ظن کہ تغافل ہے التفات
دل کی یہ ضد کہ درد ہے درماں مرے لئے

فرمانِ قتل ہو جو نہیں اذن پائے بوس
آخر ہو کچھ تو اے شہِ خوباں مرے لئے

نزدیک ہے کہ شوق سُنے وعدۂ وصال
لبہائے نازِ یار ہیں لرزاں مرے لئے

عشقِ بتان و ذوقِ سماع و ہوائے مے
زاہد کے حق میں کفر ہے ایماں مرے لئے

حسرتؔ کوئی مدد نہ کرے کیا مضائقہ
کافی ہیں غوثِ اعظمِ جیلاں مرے لئے

وہ چپ ہو گئے مجھ سے کیا کہتے کہتے
کہ دل رہ گیا مدّعا کہتے کہتے

مرا عشق بھی خود غرض ہو چلا ہے
ترے حسن کو بے وفا کہتے کہتے

شبِ غم کس آرام سے سو گئے ہم
فسانہ تری یاد کا کہتے کہتے

یہ کیا پڑ گئی خوئے دشنام تم کو
مجھے ناسزا برملا کہتے کہتے

عجب کیا جو ہے بدگماں سب سے واعظ
بُرا سنتے سنتے، بُرا کہتے کہتے

وہ آئے مگر آئے کس وقت حسرتؔ
کہ ہم چل بسے مرحبا کہتے کہتے

وعدے کی شب ہجومِ تمنّا ابھی سے ہے
سرگرم کارِ خاطرِ شیدا ابھی سے ہے

حالانکہ ابتدا ابھی نہیں ہے شباب کی
ان کو کمالِ حسن کا دعوا ابھی سے ہے

آتے ہیں اُن کی دیر ہے لیکن شبِ وصال
پیشِ نظر وہ چہرۂ زیبا ابھی سے ہے

اے عشق تازہ کار تری ابتدا کو ہم — جب سوچتے ہیں کہتے ہیں گویا ابھی سے ہے

ہر لحظہ دردِ ہجر کی افزوں ہیں کاہشیں — ظاہر ہجومِ غم کا نتیجا ابھی سے ہے

برسے گا ہُن بہاریں اے پیرِ مے فروش — تیری دکانِ بادہ کا شُہرا ابھی سے ہے

دیکھیں ہوس پہ دُوریِ منزل سے کیا بنے — جس کا خیال حوصلہ فرسا ابھی سے ہے

تم سے وہ عہدِ وصل کی اُمیّد کیا کرے — جو بدگمانِ وعدۂ فردا ابھی سے ہے

اہلِ نظر کا قول یہی ہے کہ بے مثال — تیرا جمال اے گُلِ رعنا ابھی سے ہے

جس راہ سے وہ آنے کو ہیں آج اس طرف — شوقِ نگاہِ محوِ تماشا ابھی سے ہے

حسرتؔ کو شامِ وصل ہے پاسِ حیائے یار — گو شوقِ پائے بوس کا ایما ابھی سے ہے

حصّہ ہفتم

ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء

ہر چند ہو کے جان سے بیزار جائے گا
پر واں ضرور طالبِ دیدار جائے گا

گھسنے نہ پائے گا تری محفل میں وہ کبھی
ساقی یہاں سے آج جو ہشیار جائے گا

زنہار بزمِ یار سے عاشق رہے جو دور
جب شوقِ دید اٹھائے گا ناچار جائے گا

صبر و قرار ہوش و خرد جان و مال و دیں
ہو گا جو کچھ حضور میں در کار جائے گا

پروا نہ ہو گی اس کے دلِ بے ملال کو
صدمہ فراقِ یار کا بیکار جائے گا

تیری گلی میں بیٹھ کے اٹھتے ہیں ہم کہاں
اور ہم اٹھے بھی دل تو نہ زنہار جائے گا

درباں کی دور باش کا حسرت کو غم کہاں
اک بار وہ بلائیں تو سو بار جائے گا

جواب اُن سے ملنا دوبارہ نہ ہو گا
تو جینا بھی شاید ہمارا نہ ہو گا

وہ ملتے رہیں گے تصور میں ہم سے
غمِ ہجر بھی ناگوارا نہ ہوگا

ہمیں پھر بھی لے جائیگا اُس گلی میں
کہ اس کے سوا دل کو چارا نہ ہوگا

اُجڑ جائے گی بزمِ رنداں تو ساقی
مروّت نہ ہو گی مدارا نہ ہوگا

ہمیں گھر میں لائے تو وحشت یہ بولی
یہاں پر ہمارا گزارا نہ ہوگا

سُنائیں انھیں حالِ دل، یا دہم کو
بھلا کچھ تو ہو گا جو سارا نہ ہوگا

کوئی شکوہ سنجِ ستم اور ہوں گے
وہ کہتے ہیں حسرت ہمارا نہ ہوگا

ساکتِ یاس ہیں جان و دلِ ناکامِ شباب
کیا ہوا آہ وہ ہنگامۂ ایامِ شباب

منتظرِ مرگ مناجات کی ہر دم ہے دعا
اب نہ آسائشِ پیری ہے نہ آرامِ شباب

قابلِ دید ہوئی حُسنِ درخشاں کی بہار
کیا سے کیا ہو گئے ہو کر وہ گل اندامِ شباب

مئے تنویر سے مخمور ہوئی روحِ جمال
بادۂ عیش سے لبریز ہوا جامِ شباب

دل ربائی ہے خود اس جانِ جوانی کی غلام
مالکِ نازِ ادا ہے وہ دلارامِ شباب

ہوسیں وصلِ بُتاں کی نہ مٹی ہیں نہ مٹیں
ہم سے چھوٹی ہے نہ چھوٹے مئے گلفامِ شباب

درپئے دین و دل و جاں ہیں بُتانِ کافر
حسرت اچھا نظر آتا نہیں انجامِ شباب

ہم شکوۂ فلک ہی کریں گے حضورِ دوست
ظاہر نہ ہونے دیں گے وہاں بھی قصورِ دوست

آئے ہیں دیر مجھ کو ہوئی ہے تو کس قدر
مضطر ہے قتل گہ میں دلِ ناصبورِ دوست

محفل میں دورِ ساقیِ مے ہے ہمیں بھی آج
کا ہے کو بچنے دے گی نگاہِ سرورِ دوست

میری تسلیوں کے نہیں ہیں جو مشورے
پھر کیوں جوابِ خط میں بہم ہیں سطورِ دوست

بیجا نہیں ترانۂ مطرب سے وجدِ رُوح
کانوں میں آ رہی ہے یہ آوازِ دُورِ دوست

ہوگی ضرور قدرِ وفا، دل ابھی سے کیوں
کرتا ہے شکوۂ ستمِ بے شعورِ دوست

اظہارِ شوق کی متحمل نہ ہو سکی
برہم غضب ہے رات سے طبعِ غیورِ دوست

اہلِ ہوس کی سچ ہیں ساری شکایتیں
بجا ہے کمالِ حسن پہ حسرت غرورِ دوست

اپنی ذلت کا وہ مغرور تو کیا ہے باعث
خود ہمارا دلِ مجبور ہوا ہے باعث

اس جفاکار کی آنکھیں بھی جو نم ہیں اس کا
یادِ محرومیِ اربابِ وفا ہے باعث

آپ کی ایک نظر کے یہ کرشمے ہیں تمام
صحتِ دل کی دوا ہے نہ دعا ہے باعث

بد کو بھی نیک سمجھتے نہیں کیوں عاشقِ حق
فرض کیا ہے جو نہیں بد کا خدا ہے باعث

رحمتِ حق ہے مگر میرے معاصی کی جزا
کہ ہے باعث اگر اس کا تو عطا ہے باعث

یہی لائی ہے اُڑا کر ترے ملبوس کی بُو
بیخودی ہائے تمنا کی صبا ہے باعث

ذکرِ حسرت پہ وہ بولے مری رسوائی کا
یہی دیوانہ یہی بے سر و پا ہے باعث

مجھ سے جو دردِ دل کا بھی ہوتا نہیں علاج
ہے کس مرض کا اور تو اے نازنیں علاج

اہلِ ہوس کے دردِ تمنا کا بر محل
کرتی ہے خوب وہ نگہِ خشمگیں علاج

بیمارِ غم ہوئے ہوں جو تیرے فراق میں
ایسوں کا تو ضرور ہے اے مہ جبیں علاج

پایا کہیں کسی نے بھی ہے دردِ عشق کا
کوئی بھی اے طبیب ترا دل نشیں علاج

اس دل کو اب گزار کرے فکرِ عاشقی
جس کا نہ کر سکے غمِ دُنیا و دیں علاج

پھر کیوں دوائے درد کے درپے ہیں چارہ گر
جب خود ہی چاہتی نہیں جانِ حزیں علاج

حسرت شرابِ وصل سے صحت جو ہو تو ہو
دل کا نہیں ہے ورنہ مے و انگبیں علاج

وہ دیکھنے جو بام پہ آئے بہارِ صبح
نازاں ہے اپنے بخت پہ کیا کیا نگارِ صبح

پیدا فلک پہ ہے یہ بیاضِ سحر کا نور
ظلماتِ شب میں یا ہے رواں جوئے بارِ صبح

نکلا ہے کس غرور سے ہمراہِ آفتاب
پردے سے شب کے شاہدِ رنگیں نگارِ صبح

روزِ فراقِ یار مری چشمِ یاس میں
مہرِ فلک ہوا ہے دلِ داغدارِ صبح

خورشید روئے یار سے ہو کر منیرِ حسن
شامِ شبِ وصال بھی کرتی ہے کارِ صبح

ملتے ہوئے اٹھے ہیں وہ آنکھیں جو خواب سے
پھیلا ہوا ہے نورِ جمالِ خمارِ صبح

تمکینِ حسنِ یار کے صدقے میں روزِ وصل
کچھ بڑھ گیا ہے اور بھی حسرت وقارِ صبح

دخترِ رز ترے پہلو میں نہاں ہے گستاخ
دیکھ تو کتنی یہ اے پیرِ مغاں ہے گستاخ

ہمتِ عاشقِ بیدل پہ خدا کی رحمت
کوچۂ یار کی جانب جو رواں ہے گستاخ

کس قدر ہے نگہِ شوق بھی اپنی بیباک
چہرۂ یار میں کیا کیا نگراں ہے گستاخ

عرضِ حالِ دلِ مضطر پہ وہ بولے ہنس کر — ہم سنیں کیا کہ ترا طرزِ بیاں ہے گستاخ

خوش کہ ناخوش ہو کوئی جا ہی پہنچتا ہے وہاں — اُن کی خدمت میں مرا شورِ فغاں ہے گستاخ

سُن کے آئے ہیں کسی سے جو مرے شوق کا حال — پوچھتے پھرتے ہیں سب سے وہ کہاں ہے گستاخ

کچھ غضب سے بھی ترے خوف نہیں ہے اس کا — کس قدر حسرتِ بے تاب و تواں ہے گستاخ

حاصل جو ہوئے دردِ محبّت کے لذائذ — میں بھول گیا عیش و فراغت کے لذائذ

جب تک نہ کھلے یہ کہ محبّت ہے عبادت — محسوس ہوں کیا تیری اطاعت کے لذائذ

مجموعۂ اضداد ہے دردِ دلِ عاشق — سب جانتے ہیں جسکی اذیّت کے لذائذ

ہر حرف میں اس نامۂ رنگیں کے ہیں پنہاں — جدّت کے عبادت کے اشارت کے لذائذ

مرضی پہ تری چھوڑ کے ہر امرِ اہم کو — جانے کوئی کیا فسخِ عزیمت کے لذائذ

ارواح پہ اعمال کے آثار ہیں طاری — دوزخ کے شدائد ہیں نہ جنّت کے لذائذ

پوچھے کوئی اربابِ تمنّا کے دلوں سے — حسنِ رخِ جاناں کی حکایت کے لذائذ

دل کو جو ہوئی کثرتِ عصیاں پہ ندامت — حاصل ہوئے کیا کیا تری رحمت کے لذائذ

ڈرتے ہیں جو میدانِ وغا سے انہیں حسرت — معلوم نہیں شوقِ شہادت کے لذائذ

ہوائے برشگالی ہے ہوس خیز — کرے کوئی کہاں تک مے سے پرہیز

تبسّم ہے ترا اے شاہِ خوباں — سراسر اک تماشائے دلاویز

یہاں دل خام کارِ آرزو ہے
وہاں ہے نازِ حسنِ یار نوخیز

فسونِ طرفہ ہے حرفِ لبِ یار
گہے شکر شکن گاہے نمک ریز

سب اسکو دردِ ہم کہتے ہیں درماں
اذیت بھی ہے حبس کی راحت آمیز

نہیں اب تک حواسِ عقل بر جا
شرابِ عاشقی تھی کس قدر تیز

مجھے فیضِ سخن پہنچا ہے حسرتؔ
ز روحِ پاک شمس الدین تبریز

بیخوف ہیں وہ کہتے ہیں کیا ہے تمہارے پاس
لے دے کے ایک تیرِ دُعا ہے تمہارے پاس

بیمارِ غم ہیں دور سے آتے ہیں سن کے نام
کہتے ہیں دردِ دل کی دوا ہے تمہارے پاس

کس کو نہیں قبول کہ ہے شغلِ مے حرام
پر فصلِ گل میں ہو تو روا ہے تمہارے پاس

خاموش تم ہو سب ہیں ہلاکِ فریبِ لطف
اچھی یہ تیغ نیم رضا ہے تمہارے پاس

روشن ہمارے دل میں بھی ہے اک سراجِ درد
برقِ جمال کی جو ضیا ہے تمہارے پاس

شمشیرِ عشق تیرِ ادا و تفنگِ ناز!
سب چیز اب تو نام خدا ہے تمہارے پاس

اب کیا رہے گا پہلوئے حسرتؔ میں دل بھلا
اک عمر یہ گزار چکا ہے تمہارے پاس

غم و فکرِ شوقِ تمنا سے فارغ
ہیں عاشق ترے ساری دنیا سے فارغ

نہ تم ہو مرے جذبِ الفت سے بے غم
نہ یوسف تھے عشقِ زلیخا سے فارغ

انھیں جلوہ گر دل میں ہر لحظہ پاکر
تمنائے فکرِ تماشا سے فارغ

وہ مطلق ہیں خود اُن کی نسبت ہے لیکن
نہ اعلیٰ سے فارغ نہ ادنیٰ سے فارغ
پناہِ محبت میں ہم آ کے حسرتؔ
ہوئے خوف احکام بیجا سے فارغ

اتنی کہاں ہے اور جو ہو بھی مجالِ شوق
وہ ٹال دیں گے آ رے بلے میں سوالِ شوق
ہم کو ہے دیدِ یار کی خواہش کہ فی المثل
نکلا ہے آسمانِ دعا پر ہلالِ شوق
مشہور گرچہ دُور تھی راہِ دیارِ دوست
مستانہ چل کھڑے ہی ہوئے ہم بجالِ شوق
اونچا ہوا ہے اور بھی کچھ آشیانِ حسن
کھولے ہیں جب سے مرغِ تمنا نے بالِ شوق
دل طالبِ مثال ہے بیشک مگر کہیں
حسرتؔ یہی عروج نہ ٹھیرے زوالِ شوق

چھپے گی تری دوست داری کہاں تک
کرے گا دل انکارِ یاری کہاں تک
کہیں رک بھی اے چشم خونبابہ افشاں
کہاں تک تری اشکباری کہاں تک
خدا جانے آخر ترے غمزدوں کو
ستائے گی بادِ بہاری کہاں تک
نظر باز اڑا لیں گے سب حال شب کا
چھپے گی وہ چشمِ خماری کہاں تک
سرِ راہ بیٹھے ہیں بے خواب و خور ہم
نہ نکلے گی اُن کی سواری کہاں تک
کرے گی فقیروں سے اے راہِ خوباں
تغافل تری شہریاری کہاں تک
ہمیں حالِ دل عرض کرنے نہ دے گی
بھلا اُن سے بے اختیاری کہاں تک
غرورِ آپ کا کم نہ ہو گا نہ ہو گا
جتائیں گے ہم خاکساری کہاں تک

بیاں ہو چکی ہم سے اُس گل کی خوبی — سر د برگ رنگیں نگاری کہاں تک
وہ کہتے ہیں دیکھیں تو رہتی ہے باقی — تری شانِ پرہیزگاری کہاں تک
پھر آئے گی ناکام اُس در پہ جا کر — نباہے کوئی وضعداری کہاں تک
تمنّا کو اس حد پہ رہنے نہ دے گی — ترے حُسن کی بے قراری کہاں تک
کرو سیرِ دنیائے حیرت بھی حسرتؔ — خرد مندی و ہوشیاری کہاں تک

بارہا کھائی ہو جس نے لبِ جاناں کی قسم — خضر کھاتے ہیں یہ کیا چشمۂ حیواں کی قسم
آج تو منہ لبِ ساغر سے بھڑا دے میرا — ساقیا تجھ کو مری سستیٔ پیماں کی قسم
زعفراں زارِ مسرت ہے مری کشتِ اُمید — تیری تقریر سے، تیرے لبِ خنداں کی قسم
عالمِ حُسن میں یکتا ہے ترا جلوۂ نُور — ماہِ تاباں کی قسم، مہرِ درخشاں کی قسم
آج تک یاد ہیں صدمے جو دیئے تھے تو نے — اے ستم گار تری کثرتِ احساں کی قسم
نزہتِ خلد نے اے نامۂ جاناں تیری — بارہا کھائی ہے دلچسپیٔ عنواں کی قسم
سُن کے انکار مرا ہجر میں کیا کیا حسرتؔ — ساغرِ مے نے دلائی لبِ جاناں کی قسم

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو — پھیلے جاتے ہیں رُخِ یار پہ سارے گیسو
نورِ ایماں کے معاون ہیں تمہارے عارض — کفرِ عشّاق کے حامی ہیں تمہارے گیسو
کام آئے گی وہ کیا اُن کی پریشانی میں — چشمِ بیمار کے ڈھونڈھیں نہ سہارے گیسو

مائلِ شوق مجھے پا کے وہ بولے ہنس کر
دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو

ظلمتِ زلف سے نورِ رُخِ خوباں نہ دبا
جیت عارض کی ہوئی شرط میں ہارے گیسو

فلکِ حسن پہ ہے ناز کے تاروں کی نمود
یا تہِ زینتِ افشاں ہیں تمہارے گیسو

فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرتؔ پہ جو وہ
پہلے کس ناز سے رُو رُو کے سنوارے گیسو

خلشِ یار سے خدا کی پناہ
نگہِ یار سے خدا کی پناہ

بڑھ کے اشرار سے ہوں جنکے غرور
ایسے احرار سے خدا کی پناہ

پھر ہوا دل کو شوق شاہدِ مے
ابرِ بسیار سے خدا کی پناہ

رہنماؤں کے دل بھی ہیں گمراہ
حسنِ بازار سے خدا کی پناہ

آ چکی اب کسی کو شوق میں نیند
تیرے اقرار سے خدا کی پناہ

مشورے دے جو ترکِ مے کے ہمیں
ایسے غمخوار سے خدا کی پناہ

سامنا کون کر سکے حسرتؔ
اُن کی تلوار سے خدا کی پناہ

حصۂ ہشتم

از

یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء تا ۹ نومبر ۱۹۲۳ء

معطر پا کے بوئے حسن سے سارا بدن اپنا
وہ سونگھا کرتے ہیں خود اپنے منھ سے پیرہن اپنا

رقیبوں کی ہمارے بعد اب اتنی بھی کیا کثرت
کبھی تم غور سے دیکھو تو رنگِ انجمن اپنا

ارادہ آج بے خوف و خطر ہے اُن کی محفل کا
محبت میں کوئی دیکھے تو یہ دیوانہ پن اپنا

کچھ اس عالم میں وہ بے پردہ نکلے سیرِ گلشن کو
کہ نسریں اپنی خوشبو رنگ بھولی نسترن اپنا

وہ رحم آیا تجھے مجبوریِ شوقِ شہادت پر
خبر لے ہاتھ کی خنجر سنبھال اے تیغ زن اپنا

ہمیں معلوم ہے سب حال اُس کے حسنِ ابتر کا
بناؤ اتنا نہ دکھلائے زلفِ پرشکن اپنا

سبھی کچھ ہو گیا اُن کا ہمارا کیا رہا حسرت
نہ دیں اپنا نہ دل اپنا نہ جاں اپنی نہ تن اپنا

دل کی یہ کیا مجال کہ لائے خیالِ دوست
مجھ میں کہاں یہ حال کہ دیکھوں جمالِ دوست

بیجا ہے غور سے مری نسبت سوالِ دوست
سنتے ہیں دو بھی کہیں دشمن سے حالِ دوست

عاشق بنے تھے پھر بھی کیا شکوۂ جفا
سچ پوچھئے تو ہم سے بجا ہے ملالِ دوست

پردے نظر پہ کثرتِ خوبی کے پڑ گئے
چاہا مگر نہ دیکھ سکے ہم جمالِ دوست

نعم البدل ہے عیشِ دو عالم کا رنجِ عشق
خالی ہے سب سے دل بہ وفورِ خیالِ دوست

مائل ہیں حسن کی شانِ جفا کے بھی اہلِ شوق
یکتا ہے دلبری کے ہنر میں کمالِ دوست

کافی ہے اہلِ درد کو حسرت دوائے غم
اور کیوں نہ ہو کہ غم ہے غمِ لازوالِ دوست

اُمیدِ انتظار سے ہرگز نہ آئے باز
ہم شوقِ لطفِ یار سے ہرگز نہ آئے باز

جورِ غرورِ حسن پہ بھی اہلِ آرزو
اظہارِ انکسار سے ہرگز نہ آئے باز

ہم تھے وہ بے اصول کہ با وصف ہجرِ یار
گلچینیٔ بہار سے ہرگز نہ آئے باز

میخواریاں نہ چھوٹ سکیں، رند بادہ نوش
اندیشۂ خمار سے ہرگز نہ آئے باز

کیونکر نہ سرگراں ہو ترا لطفِ بے حساب
داغوں کے ہم شمار سے ہرگز نہ آئے باز

ہم کو بھی اس سے کام نہیں کچھ، یونہی سہی
دل خواہشِ قرار سے ہرگز نہ آئے باز

ہم باز آئے عشقِ بتاں سے، مگر کہاں
خواہش کے اعتبار سے ہرگز نہ آئے باز

ہم نے گناہِ شوق میں مطلق کمی نہ کی
وہ جورِ لطف کار سے ہرگز نہ آئے باز

مجبورِ آرزو تھے جو حسرت سو مر کے بھی
شوقِ لقائے یار سے ہرگز نہ آئے باز

عشق اب ہے نہ عاشقی کی ہوس — ہم ہیں اور دل سے بیدلی کی ہوس
غنچۂ شوق ہے فسردۂ یاس — مٹ چکی سب شگفتگی کی ہوس
رہ نہ جائے ترے تغافل سے — کہیں جی ہی میں اپنے جی کی ہوس
عشق ہر چند رامِ حُسن رہا — پر نہ چھوٹی برادری کی ہوس
ہم بھی حاضر ہیں بندگی کے لئے — آپ کو ہو جو صاحبی کی ہوس
مائلِ شکوۂ جفا ہے وفا — یا یہ نیکی کو ہے بدی کی ہوس
لے گئی دل سے خوفِ رنجِ خمار — زندگی ہائے سرخوشی کی ہوس
ہم کو ان کی درشت خوئی سے — ہے عبث لطف و آشتی کی ہوس
کیوں نہ ہو دلبروں کو شوقِ ستم — اہلِ دل کو ہے بیکسی کی ہوس
بیخودی ہائے عاشقاں کو نہیں — عاقلی ہائے آگہی کی ہوس
عشقِ حسرت کو ہے غزل کے سوا — نہ قصیدے نہ مثنوی کی ہوس

جان ہے اپنی آب و گل کی خلش — مٹ چکی دل سے دردِ دل کی خلش
مدّتیں ترکِ عاشقی کو ہوئیں — کہ رہا دل نہ زخمِ دل کی خلش
گاہ گاہ اب بھی ہوتی ہے محسوس — مگر اک شوقِ مشتعل کی خلش
دل سے محروم ہو کے بھی نہ مٹی — آرزوہائے منفعل کی خلش
نہ رہا دل میں تھا جو کچھ حسرت — مگر اک دردِ مضمحل کی خلش

کیا ہے اگر مرا نہ کرے تو حسیں لحاظ — کرتا ہے عاشقوں کا کوئی بھی کہیں لحاظ

رکھنی کبھی اپنے چاہنے والوں کی بھی خبر — اس کا مگر تمہیں تو ذرا بھی نہیں لحاظ

ہر حال میں ترے جو رہے ہوں نیاز مند — ایسوں کا تو ضرور ہے اے نازنیں لحاظ

اُن سے جفائے یار کا شکوہ نہ ہو سکا — عہدِ وفا کا تھا جو دمِ واپسیں لحاظ

حسرت مرے سرشکِ محبت کی قدر کا — رکھنے لگی ہے خوب مری آستیں لحاظ

احباب نہ آئے کوئی پیغامِ اجل تک — مجبور تھے کیا کیا ترے مہجور بھی کل تک

پایا نہ کسی نے ترے وحشی کا ٹھکانا — سب ڈھونڈ پھرے بحر و بر و دشت و جبل تک

عاشق ہوں تو ہو زہد کے جھگڑوں سے رہائی — سب ہیں یہ بکھیڑے ہوسِ علم و عمل تک

خالی نہ ہمیں غم سے ملا ایک بھی لحظہ — لے شامِ ابد دیکھ چکے صبحِ اجل تک

داعی ہے محبت کا تری زہد بھی جس کو — معلوم نہیں شکر و شکایت کا محل تک

اب کچھ نہیں مطلوب قناعت کی بدولت — بے حاصلیِ حرص رہی طول و عمل تک

ہم جامی و حافظ کے بھی قائل ہیں پہ حسرت — خوبی میں نہ پہنچا کوئی سعدی کی غزل تک

یہ راحت ہے سکونِ غمِ ہجراں کی قسم — یادِ جاناں کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم

تجھ کو مخمور جو دیکھا ہے تو اے پیکرِ ناز — مست ہم بھی ہیں تری مستیِ لرزاں کی قسم

شوق سے جور کئے جائیں وہ اربابِ وفا — خوش بہر حال ہیں عیشِ غمِ پنہاں کی قسم

کافرِ عشق ہیں، نظارۂ خوباں ہیں ہمیں
سیرِ جنت ہے، ہوس کاری ایماں کی قسم

کیا تھے ہم، ہو گئے اک ساغرِ مے سے کیا ہم
جادوِ گردشِ پیمانۂ گرداں کی قسم

پیکرِ خاکیٔ عشاق بھی ہے صورتِ دل
سر بسر نور، ترے حسنِ درخشاں کی قسم

حسرتؔ اب کیوں ہیں وہ پردے میں کہ مانندِ وفاؔ[1]
ہم نہ دیکھیں گے ہمیں دیدۂ حیراں کی قسم

مانوس ہو چکے تھے ازل میں فنا سے ہم
اس انتہا کو جانتے ہیں ابتدا سے ہم

گویا وہ سب سنا ہی تو دے گی وہاں کا حال
کیا کیا سوال کرتے ہیں بادِ صبا سے ہم

دنیا کی نامرادی پیہم کے عذر پہ
محشر میں تم کو مانگ نہ لیں گے خدا سے ہم

بن کر گدائے عشق گئے تھے، مگر پھرے
سلطان ہو کے یار کی دولت سرا سے ہم

عرضِ کرم سے پہلے ہی بولے وہ روزِ وصل
شرمندہ ہوں کہیں نہ تری التجا سے ہم

اس انجمن کے شوق میں جی کا زیاں سہی
اک بار ان کو دیکھ تو لیں گے بلا سے ہم

کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو
آنکھیں جب اپنی ملتے ہیں انکی روا سے ہم

محرومیاں بھی جن کی ہیں عنوانِ التجا
کہتے ہیں وہ کہ ڈرتے ہیں اہلِ وفا سے ہم

حسرتؔ خیالِ غیر سے بیگانہ ہو گئے
مانوس ہو کے اس نگہِ آشنا سے ہم

عاشقوں سے ناروا ہے بیوفائی آپ کی
حد سے بڑھ جائے نہ شانِ کج ادائی آپ کی

---

[1] مرحوم حکیم عبدالہادی خاں رامپوری وفاؔ تخلص

آرزو کے دل پہ آئیں گی نہ کیا کیا آفتیں
در پئے انکار ہے نا آشنائی آپ کی

خوب رو ہیں آپ، مانا ہم نے، پھر بھی اس قدر
دیکھئے اچھی نہیں ہے خود ستائی آپ کی

رہ گئی اہلِ ہوس میں، یادگارِ حسن و عشق
ناز برداری ہماری دل رُبائی آپ کی

مجھ سے اکثر یہ کہا کرتا ہے وہ مخمورِ ناز
دیکھئے نبھتی ہے کب تک پارسائی آپ کی

اک ہمیں تو کچھ نہیں ہیں آپ کے طاعت گزار
تابعِ فرماں ہوئی ساری خدائی آپ کی

کیسے دیکھے کون دیکھے آپ کا نورِ جمال
جان جب ٹھہری ہوئی ہو رونمائی آپ کی

آپ کو آتا رہا میرے ستانے کا خیال
صلح سے اچھی رہی مجھ کو لڑائی آپ کی

برقؔ کا اکثر یہ کہنا یاد آتا ہے مجھے
تنکے چنوانے لگی ہم سے جُدائی آپ کی

عرض کر کے حالِ دل کس وجہ ہیں محجوب ہم
دیکھ کر غصّے میں صورت تمتمائی آپ کی

شاہِ جیلاں کے سوا مشکلکشا کے واسطے
کون کرتا اور حسرتؔ رہنمائی آپ کی

کس قدر دشوار تھی ہم پر جُدائی آپ کی
بارے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپ کی

بدگماں کا ہے کو ہوتا آپ کا حسنِ غیور
ہم نے کیوں تصویر آنکھوں سے لگائی آپ کی

نَے نوازِ عاشقی نے نغمہ ہائے حسن میں
بارہا آواز کانوں کو سُنائی آپ کی

شکوۂ غم کر کے نادم ہے بہت پاسِ وفا
یعنی ہم نے کس لئے غلطی جتائی آپ کی

فرق اور فرقِ زمین و آسماں آیا نظر
شکل جب تصویرِ یوسف سے ملائی آپ کی

بھول بیٹھے تھے الٰہی کیا کریں اس دل کو ہم
ہجر میں پھر یاد جس دل نے دلائی آپ کی

مجھ کو جو آتی ہے وہ لاریب ہے خوشبوئے حسن
ورنہ کوشش عطر میں کس نے بسائی آپ کی

ربط جب دیکھا کہ غیروں سے بڑھایا آپ نے
رفتہ رفتہ ہم نے بھی چاہت گھٹائی آپ کی

آپ بھولے آپ کی صورت بھی بھولی، اک مگر
دل سے کب تصویرِ غم ہم نے مٹائی آپ کی

دل کہ مالا مال غم تھا، کتنی بیدردی کے ساتھ
ہم نے رو رو کر وہ سب دولت لٹائی آپ کی

جس سے حسرت ہو گئی زیر و زبر بزمِ سماع
کس قیامت کی غزل مطرب نے گائی آپ کی

عقدہ وصالِ یار کا حل ہو تو جانیے
خوف[1] و خلوص[2] علم[3] و عمل[4] ہو تو جانیے

گھبرا کے روح کہتی ہے روزِ فراقِ یار
اس نامراد آج کی کل ہو تو جانیے

تمکین و قہرِ یار میں مشکل ہے امتیاز
غصّے سے ابروؤں پہ جو بل ہو تو جانیے

رہتی ہے یوں تو غیر سے روز اُنکی چھیڑ چھاڑ
کچھ واقعی بھی ردّ و بدل ہو تو جانیے

تاریکیٔ فراق بہ نورِ خیالِ یار
شامِ ابد سے صبحِ ازل ہو تو جانیے

کیونکر کھلے ہوئے ہیں وہ کس بات پر خفا
کچھ بھی جو بے رخی کا محل ہو تو جانیے

حسرت بہ رنجِ ہجر یہ قید اور یہ جورِ غیر
اس کشمکش میں آج غزل ہو تو جانیے

من توسے پریت لگائی کنھائی
کاہو اور کی سُرت ابکا ہیکا آئی

گوکل ڈھونڈھ بندرابن ڈھونڈو
برسانے لگ گھوم کے آئی

تن من دھن سب وار کے حسرت
متھرا نگر چل دھونی رمائی

حصۂ نہم

۱۹۲۳ء

ان میں دیکھا جو ماجرا دیکھا
کیا بتائیں کسی سے کیا دیکھا

ہم نے غیرت کو بھی کرم سے ترے
بارہا محوِ التجا دیکھا

حال میرا خراب ہے کہ نہیں
آج تو آپ نے بھی آ دیکھا

کوئی دنیا ہے حسن میں اے شوق
تو نے ان سا بھی دلربا دیکھا

اہلِ عالم سب آئے غیر نظر
اک تمھیں صورت آشنا دیکھا

نہ بچا اس نگاہِ ناز سے دل
ہم نے سو سو طرح چھپا دیکھا

بزمِ ساقی میں جوشِ مے کا مزا
آج رندوں نے خوب اٹھا دیکھا

تو کسی کا نہیں تجھے ہم نے
خوب اے شوخ بے وفا دیکھا

غیر جانا انھیں سو کیوں حسرت
عشق کو حسن سے جدا دیکھا

ہر گھڑی وردِ لبِ شوق ہے افسانہ ترا
بے خبر تیرے سوا سب سے ہے دیوانہ ترا

مستئ حسن کو درکار ہے دے دے اے عشق
دل کہ لبریز مے شوق ہے پیمانہ ترا

کتنے دل ہیں ترے قابو میں نہ ہے شانِ جمال
جا ہے کلمہ جو پڑھے شوکتِ شاہانہ ترا

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے مرا شہرۂ عشق
دُور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا

بے خرد ہو کے محبّت کی بدولت اے عقل
نام بھی اب نہیں لیتا دلِ فرزانہ ترا

پایۂ عرش کو از خود نہیں جنبش اے دل
دیکھ پہنچا ہے کہاں نعرۂ مستانہ ترا

فکرِ کونین سے بیگانہ ہوا تو حسرت
خوب ٹھہرا غمِ جانانہ سے یارانہ ترا

ترے حسن کا دَور دَورہ رہے گا
نہ میرا یہ جوشِ تمنا رہے گا

مگر سالہا سال بعدِ فنا بھی
زمانے میں دونوں کا چرچا رہے گا

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہیگی
نہ حکام کا جورِ بے جا رہے گا

زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جسمیں
کسی کا نہ محنت پہ دھوکا رہے گا

یہ سب لے کے مال و دل و جان و ایماں
ترا پھر بھی ہم پر تقاضا رہے گا

مرے شوق کا ہے جو یہ اضطرابھی سے
بھلا وصل میں کیا ٹھکانا رہے گا

دلِ زار اب اپنے پہلو میں ہرگز
نہ تھاما رکے گا نہ دابا رہے گا

جو مٹ جائیگا ہو کے خاک اس گلی میں
وہ اچھا رہا ہے وہ اچھا رہے گا

اسے کیا ہو پروائے محشر جو تیرا
بدستور محوِ تماشا رہے گا

وہ حسن و محبت میں یکساں ہے کامل — وہ دونوں کی آنکھوں کا تارا رہے گا
ترے عشق میں دعوئ صبر حسرت — ابھی تک بھلا کیا رہا کیا رہے گا

کوچہ اس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا — دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا
پردہ ہم سے وہ جو کرتے تھے نہ کرنے پائے — شوقِ بیباک نے اُسکو بھی اُٹھا کر چھوڑا
بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے — ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
تجھ سے ملنے پہ کسی کی ہمیں پروا نہ رہی — سب کو دنیا میں تری یاد لگا کر چھوڑا
ان کے آنے کی خبر سن کے تمنّا نے مری — دل میں اک شوق کا طوفان بپا کر چھوڑا
لطفِ ماضی کی جو کچھ یاد تھی باقی دل میں — اس کو بھی تیرے تغافل نے مٹا کر چھوڑا
مجھ کو معلوم ہے پیمانۂ مے میں ساقی — تو نے جو کچھ کہ مری آنکھ بچا کر چھوڑا
دامنِ حسن ترا خونِ شہادت نے مرے — عطرِ خوشبوئے محبّت میں بسا کر چھوڑا
مرگِ حسرت کا بہت رنج کیا، آخر کار — اثرِ عشق نے اُن کو بھی رُلا کر چھوڑا

جس فتنۂ دوراں کو ابھی آئے تھے کل دیکھ — چلتے ہیں لئے پھر تجھے اے دل وہیں چل دیکھ
یہ بھی ہے کوئی بات کہ وعدے ہی کئے جا — اور حال مرا آن کے دیکھ آج، نہ کل دیکھ
برگشتہ مرے بخت پہ کر طعن ہزاروں — اور زلف کا اپنی نہ تو خم دیکھ نہ بل دیکھ
کیا کیا شبِ غم دل ہمیں دیتا ہے تسلّی — اب جلد ہی آنے کو ہے پیغام اجل دیکھ

چھپتے ہیں کب اے شوخ ترے ناز کے انداز
تیور نہ یہ بدلے ہیں نہ بدلیں گے بدل دیکھ

دل کو مرے قابو میں نہ پاکر وہ بصد ناز
بولے کہ نہ دیوانہ بن اتنا بھی سنبھل دیکھ

کاکل میں بھی اب سیر کریں شامِ ابد کی
عارض میں ترے خوب ہے صبحِ ازل دیکھ

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسینِ سخن کا
میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

گلشن میں نہ دل بلبلِ ناکام لگائے
پنہاں یہیں صیاد بھی ہے دام لگائے

یہ بات عجب عادتِ انساں میں ہے داخل
تقدیر کا خود کرکے خطا، نام لگائے

اک سمت کہیں بزمِ طرب میں کوئی مسرور
ہونٹوں سے ہے جامِ مئے گلفام لگائے

اور ایک طرف بسترِ غم پہ کوئی مہجور
چھاتی سے پڑا ہے دلِ ناکام لگائے

مسجد میں کہیں محوِ عبادات ہیں زاہد
جنت کی دلوں کو طمعِ خام لگائے

بیٹھا ہے کہیں راہ خراباتِ مغاں میں
دُکانِ ہوس کوئی مے آشام لگائے

حصّہ دہم

از

جنوری سنہ ۱۹۲۴ تا مارچ سنہ ۱۹۲۴ء

کچھ خوف خدا کا ہے نہ ڈر خلقِ خدا کا
کیا آئے خیال اُن کو شہیدانِ وفا کا

خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے
تجھ تک نہ ہوا تھا جو گزر بادِ صبا کا

طولِ شبِ ہجراں میں پریشانیٔ دل پہ
طرّہ ہے خیال اور بھی اس زلفِ دوتا کا

خطرہ بھی تری خُو سے ہے اُمید کرم کو
عالم ہے شبِ وصل عجب بیم و رجا کا

نکلا نہ کرو خود پہ ہے تعزیر کہ لپکا
پڑ جائے گا عصیانِ محبت کو سزا کا

سر ہے انھیں مطلوب تو دو شوق سے حسرتؔ
اس امر میں کچھ دخل نہیں چون و چرا کا

بے شکرِ گُل رہے دلِ بلبل کہاں تلک
اے ساقیٔ بہار تغافل کہاں تلک

ہم سے گناہ گار بھی جنّت میں جائیں گے
کام آئے گا نہ اُن کا توسُّل کہاں تلک

تدبیر نغمہ سنج ترقی ہے غافلو! — تقدیر نوحہ خوانِ تنزل کہاں تلک

اے دل کر اختصار کہیں داستانِ عشق — ان کو رہے گی یاد بھلا کُل کہاں تلک

آخر مزید رنجِ شمیمؔ و عزیزؔ پہ[لہ] — حسرتؔ خیالِ برقؔ و تجملؔ کہاں تلک

دل کے زخموں کا جب حساب نہ ہو — کیا کہیں گر نہ بے شمار کہیں

مر مٹے ہیں اسی لئے کہ ہمیں — شاید اپنا وہ جاں نثار کہیں

مایۂ عیش بھی ہے غم کی خلش — اب اسے گُل کہیں کہ خار کہیں

روئے جاناں کے عاشقوں کو نہ کیوں — لوگ دیوانۂ بہار کہیں

اُن کی آنکھیں اگر کہیں، تو غضب — دل کا افسانہ آشکار کہیں

نامرادی مُراد ہے حسرتؔ — جب تمہیں خود وہ خاکسار کہیں

ہم حال انھیں دل کا سُنانے نہیں لگے ہیں — کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے نہیں لگے ہیں

لاکھوں ہیں تری دید کے مشتاق۔ مگر ہم — محروم تجھے دل سے بھُلانے نہیں لگے ہیں

اور ایسے کہاں حیرت و حسرت کے مُرقعے — اے دل جو ترے آئینہ خانے نہیں لگے ہیں

کہنا ہے انھیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب — پر کہتے نہیں زلف بنانے نہیں لگے ہیں

لہ عبداللہ خاں شمیمؔ باندوی، عزیزؔ اللہ گورکھپوری، عظمت اللہ برقؔ کان پوری
تجملؔ حسین گورکھپوری، مرحوم فقیر حسرتؔ موہانی

کچھ ہوش سر و پا کا نہیں، رندِ خرابات — اٹھی ہے گھٹا، دھوم مچانے میں لگے ہیں
قاتل ترے دامن پہ مرے خون کے دھبّے — کچھ اور بھی خنجر سے چھٹانے میں لگے ہیں
ہر دم ہے یہ ڈر پھر نہ بگڑ جائیں وہ حسرتؔ — پہروں جنھیں رو رو کے منانے میں لگے ہیں

ترے در کی خاک ہو کر دو جہاں میں نام کرتے — ابھی اور بھی وہیں ہم کوئی دن مقام کرتے
بہ کمالِ سرفرازی میں شہیدِ ناز ہوتا — جو وہ خنجرِ جفا سے مجھے خود تمام کرتے
نہ کسی نے یہ سمجھایا، نہ خود اُن کے جی میں آیا — کہ مزارِ عاشقاں تک وہ کبھی خرام کرتے
مجھے دیکھتے ہی بولے کہ یہ کون بے ادب ہے — وہ بھلا سلام لیتے وہ بھلا کلام کرتے
ہمیں کیا بھلا ٹھکانی رہِ شوق کی درازی — کہ تمہیں اگر نہ پاتے سفرِ دوام کرتے
جسے کہتے ہیں اہمسا اک اصولِ خودکشی تھا — عمل اس پہ کوئی کہتا نہ کبھی عوام کرتے
چلو جان دے کے حسرتؔ ہوئی خوب غم سے فرصت — وہ کبھی نہ تم سے ملتے یونہی صبح و شام کرتے

نہ صورت کہیں شادمانی کی دیکھی — بہت سیرِ دُنیائے فانی کی دیکھی
مری چشمِ خونبار میں خوب رہ کر — بہار آپ نے گل فشانی کی دیکھی
تمنّا نے اس روئے زیبا کو دیکھا — کہ تصویرِ حُسنِ جوانی کی دیکھی
عجب شوق ہے دستِ ساقی میں ہم نے — صراحی مئے ارغوانی کی دیکھی
زہے رعبِ حُسن، اُن کے در پہ کسی نے — ضرورت نہ کچھ پاسبانی کی دیکھی

نہ تم سا خوش اخلاق پایا، نہ ہم نے — کہیں شان یہ دلِ ستانی کی دیکھی
مجھے کرکے مایوس بولے وہ حسرتؔ — مسرّت غمِ جاودانی کی دیکھی

دردِ دل کی انھیں خبر نہ ہوئی — کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
کوششیں ہم نے کیں ہزار مگر — عشق میں ایک معتبر نہ ہوئی
کر چکے ہم کو بے گناہ شہید — آپ کی آنکھ پھر بھی تر نہ ہوئی
نارسا آہ عاشقاں وہ کہاں — دُور ان سے جو بے اثر نہ ہوئی
آئی بجھنے کو اپنی شمعِ حیات — شبِ غم کی مگر سحر نہ ہوئی
شب تھے ہم گرم نالہ ہائے فراق — صبح اک آہ سرد سر نہ ہوئی
تم سے کیونکر وہ چھُپ سکے حسرتؔ — نگہہ شوق پردہ ور نہ ہوئی

حصۂ یازدہم

از

جنوری ۱۹۲۵ء تا دسمبر ۱۹۳۴ء

یوں ہی مائل ہے سر اُس کی جبیں سائی کا
شوق محتاج نہیں حوصلہ افزائی کا

آج کل حسنِ رُخِ یار کی بے تابی کو
ضد یہ ہے نام نہ لے کوئی شکیبائی کا

یہ بھی احسان ہے ان کا کہ مجھے کر کے تباہ
دیکھنے آئے تماشا مری رُسوائی کا

رنج دوری سے ہوا عیشِ تصوّر جو بہم
ہو گیا اور ہی عالم شبِ تنہائی کا

ان سے اربابِ نظر کی ہے یہ خواہش حسرتؔ
اٹھ رہے کوئی دقیقہ نہ خود آرائی کا

عرفانِ عشق نام ہے میرے مقام کا
حامل ہوں کس کے نغمۂ نے کے پیام کا

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بُوئے اُنس
دنیائے جاں ہیں شور ہے جس کے دوام کا

مخلوق اک نگاہِ کرم کی اُمیدوار
مستانہ کر رہی ہے بھجن رادھے شام کا

محبوب کی تلاش ہوئی رہبرِ محب
برسانے سے جو قصد کیا نند گام کا

گوکل کی سرزمیں بھی عزیزِ جہاں بنی
کلمہ پڑھا جو اُن کی محبت کے نام کا

بندرا کا بن بھی رو کشِ جنت بنا، کہ تھا
پامالِ ناز انھیں کی بہارِ خرام کا

لبریز نور ہے دلِ حسرت نہ ہے نصیب
اک حسنِ مشک فام کے شوق تمام کا

وہ کہتے ہیں پھر تجھ کو آنا پڑے گا
ہمیں کو پھر اُلٹے منانا پڑے گا

نہ جب تجھ سے مطلب رہا کچھ تو دل سے
تری یاد کو بھی بھلانا پڑے گا

تری یاد بھی چھوٹ جائیگی لیکن
بہت دل کو صدمہ اٹھانا پڑے گا

کہاں جائیگی عشق بازی کی عادت
کہیں اور دل کو لگانا پڑے گا

تجھے بزمِ خوباں میں درخور کا اپنے
بلا کر نمونہ دکھانا پڑے گا

دکھا کر تماشائے واسوختن آخر
تجھے پھر سے اپنا بنانا پڑے گا

ارادے غرض ہیں بہت کچھ یہ حسرت
وہ کہتے ہیں پھر تجھ کو آنا پڑے گا

کرنے کو تو میں عہد کروں ترک ہوس کا
پر دل سے کہوں کیا جو نہیں ہے مرے بس کا

بے تجھ سے ملے گھر میں وہی حال ہے میرا
ہو صحنِ چمن میں جو گرفتار قفس کا

پھر لے کے چلا دل ہمیں تا کوئے ملامت
خطرہ نظر آیا کچھ اُسے پیش نہ پس کا

کیا جلد ہوا خاتمہ دورِ تمنا
وقفہ نہ ملا شوق کو دو چار برس کا

بیگانۂ آئینِ محبّت ہیں وہ حسرتؔ
رکھتے ہیں جو عشاق پہ الزام ہوس کا

اب کہاں صبر اور قرار کا ہوش
مطربِ عشق ہے ترانہ فروش

ہو رہی ہے صباحِ عشق طلوع
ہو چلے ہیں چراغِ عقل خموش

حلقۂ زاہداں کی ہو حق پر
طعنہ زن ہے ترے جنوں کا خروش

شوق فرمائے وصلِ یار ہیں اب
فکرِ امروز ہے نہ شکوۂ دوش

دعوئ ترکِ مے نہ کر حسرتؔ
حکمِ ساقی اگر ہوا کہ بنوش

وفا تجھ سے اے بیوفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

تری آرزو ہے اگر جرم کوئی
تو اس جرم کی میں سزا چاہتا ہوں

وہ مجھ کو برا جانتے ہیں تو جانیں
میں اس پر بھی اُن کا بھلا چاہتا ہوں

تجھے خیلِ خوباں سے اے جانِ خوبی
جدا جانتا۔ مانتا، چاہتا ہوں

میں بیمارِ غم ہوں، مداوائے غم کو
ترے در کی خاکِ شفا چاہتا ہوں

نصیحت گروں کی ملامت سے بےغم
میں اُس شوخ کو برملا چاہتا ہوں

اسے لب بتائے وہ خود جانتے ہیں
جو میں اپنے حق میں دعا چاہتا ہوں

ترے زلف و رخ کے تصوّر کی نعمت
شب و روز صبح و مسا چاہتا ہوں

میں اس طرۂ زلفِ مشکیں کو حسرتؔ
پئے غارتِ جاں دوتا چاہتا ہوں

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ رہتے تھے بہم دونوں
نہ تھے آگاہِ آزارِ غمِ فرقت سے ہم دونوں

نہ کر سکتا تھا باہم فرق محبوب و محب کوئی
جدا ہونے لگے تھے جس گھڑی با چشمِ نم دونوں

نہ ہم پر ہے نہ دشمن پر کرم اس شوخِ پُر فن کا
بہم ہے رشک دونوں کو مگر ہیں وقفِ غم دونوں

جمالِ یار سے روشن بہر شان و بہر صورت
مرے پیشِ نظر ہیں جلوۂ دیر و حرم دونوں

دل و جانِ مُحبّاں پر ہے یکساں لطفِ عام اُس کا
نگاہِ یار کے حسرتؔ ہیں ممنونِ کرم دونوں

ہم کو ہوش و خرد سے کام نہیں
عشق پابندِ انتظام نہیں

حیف اُس دل کی بے ملالی پر
جو ترے غم سے شاد کام نہیں

عالمِ جاں میں نورِ غم کی ضیا
صُبح گویا ہے جس کی شام نہیں

کہتے ہو تم یہی سزا ہے تری
ہم کو اس میں بھی کچھ کلام نہیں

جام جب تھا تو مے نہ تھی حسرتؔ
اب جو مینا ملا تو جام نہیں

تحسین ہے لب پر ترے دشنام نہیں ہے
الزامِ تمنّا کوئی الزام نہیں ہے

خوبی تری بے قید ہے خواہش مری بیحد
ان دونوں کے آغاز کا انجام نہیں ہے

ایسا کوئی دنیا میں نہیں عشق نظر باز
اے حُسنِ دلارا جو ترا رام نہیں ہے

بیٹھے ہیں تری یاد میں کونین سے فارغ
اب ہم کو کسی چیز سے کچھ کام نہیں ہے

پرنورِ مئے عشق سے دل روشنِ عرفاں
آئینۂ عالم ہے مرا جام نہیں ہے

برپا ہیں بہر سمت حوادث کے تلاطم — دریا مری تقدیر کا آرام نہیں ہے
دیوانہ ہوں ساقی کی نظر کا، مری مستی — حسرتؔ گرہِ بادۂ گلفام نہیں ہے

پھر اک شوقِ بسیار کی آرزو ہے — طوافِ درِ یار کی آرزو ہے
جو لبریز ہو بادۂ عشقِ حق سے — پھر اس جامِ سرشار کی آرزو ہے
دو عالم کے افکار سے ہو کے فارغ — روانِ سبکسار کی آرزو ہے
نہ ہو کم ترے درد کی جاں نوازی — یہ بھی اور دلِ زار کی آرزو ہے
گناہِ محبت کا بندہ ہوں مجھ کو — جنونِ خطا کار کی آرزو ہے
تن آسانیاں دوسروں کو مبارک — یہاں امرِ دشوار کی آرزو ہے
متاعِ دل و جاں کو ہم لیکے حسرتؔ — چلے ہیں خریدار کی آرزو ہے

بنے وہ رونقِ محفل جس انجمن میں رہے — رہے بہارِ چمن ہو کے جس چمن میں رہے
قریب ہے کہ ترے سوزِ غم سے میرے لئے — بوجہ نور نہ کچھ فرق جان و تن میں رہے
نہ ہے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب — وہ ابتری جو تری زلفِ پرشکن میں رہے
ادب کا ہے یہ تقاضہ کہ تیرے شوق کی بات — سنے نہ کوئی مرے دل میں یا دہن میں رہے
جو فیضِ عشق یہی ہے تو کیا عجب حسرتؔ — کہ امتیاز نہ کچھ شیخ و برہمن میں رہے

محبوب ہی محبوب کی ہر بات بجا ہے
پھر شکوۂ غم کا مجھے کیوں شوق ہوا ہے

ہم خوش ہیں بہر حال جفا ہو کہ وفا ہو
اب مجھ سے تغافل بھی وہ فرمائیں تو کیا ہے

سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں
اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشا ہے

کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں لیکن
کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے

ہم چھین کے لے بھی گئے پان آپ کے منھ کا
کہتے ہی رہے آپ کہ دیں گے نہ دیا ہے

شرما کے وہ بولے بھی تو کیا "ہم سے نہ بولو"
پھر ہنس کے وہ کہہ دینگے یہی تیری سزا ہے

وہ یوں کہ محبّت کی سزا میں بھی مزا ہے
کیا خوب تری چھیڑ کا حسرتؔ یہ صلا ہے

حصّہ دوازدہم

از

جنوری سنہ ۱۹۳۵ تا جون سنہ ۱۹۴۰ء

گاہے یکسر لطف گاہے سر بسر بیداد ہیں
دلربائی کے انھیں کیا کیا طریقے یاد ہیں

مرحبا اے حسنِ غم اے یادگارِ عشقِ دوست
جان و دل تیری بدولت شاد ہیں آباد ہیں

کچھ تو بارے وہ تغافل میں کمی کرنے لگے
جب سے یہ جانا کہ ہم آمادۂ فریاد ہیں

حسنِ صورت میں ترے شامل ہے حسنِ التفات
ہم انھیں باتوں سے تو گرویدہ ہیں برباد ہیں

چھیڑ سے بولے وہ حسرت کیوں ہمیں چاہو کہ ہم
بے مروّت ہیں، جفاجو ہیں، ستم ایجاد ہیں

تری یاد بے اختیار آ رہی ہے
تمنّا کی فصلِ بہار آ رہی ہے

حرم سے ہوا خوشگوار آ رہی ہے
دوائے دلِ بے قرار آ رہی ہے

ترے کہنہ ملبوس کی دھجّی دھجّی
پئے راحتِ جاں بکار آ رہی ہے

کہوں حال کیا اس کی جاں پروری کا
جو کعبے سے خوشبوئے یار آرہی ہے
ہوس دل کی ان سے جدا ہو کے حسرت
سراسیمہ و اشکبار آرہی ہے

پھر حالِ دل قرار سے بے زار ہو چکا
جینا فراقِ یار میں دشوار ہو چکا
واں تک پہنچ پہنچ کے پھر آیا ہوں بے مراد
ایسا تو اس گلی میں کئی بار ہو چکا
اس شوخ بادہ خوار کو در بابِ مے کشی
اصرار ہے تو ہم سے بھی انکار ہو چکا
رنگینیٔ سرشکِ محبت سے بارہا
دامانِ آرزو گل و گلزار ہو چکا
اب حسن و عشقِ سادہ کی وہ پاکیاں کہاں
تم شوخ ہو چکے ہیں ہوس کار ہو چکا
اہلِ نظر کو دیکھ کے مجبورِ اشتیاق
وہ حسنِ بے خبر بھی خبردار ہو چکا
حسرت نیازِ عشق بایمائے نازِ حسن
رازآشنائے لذتِ آزار ہو چکا

خود ہم کو بلانے لگے دے دے کے وہ قسمیں
باقی نہ کوئی فرق رہا عشق و ہوس میں
موقع ہے عجب کشمکشِ لطف و ستم کا
قابو میں ہیں وہ ناز کے ہم شوق کے بس میں
نسبت ہے وہی عاشقی و حسن میں باہم
فی الجملہ ہوا کرتی ہے جو شعلہ و خس میں
لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سویت
دو ایک برس میں ہو کہ دس بیس برس میں
یاد ان کی ہوئی وجہ سکوں ہجر میں حسرت
بلبل کے لئے بادِ بہار آئی قفس میں

تیرِ ناز آئے تو اُن کا آزمانے کے لئے
پیش کرتے ہیں دل اپنا ہم نشانے کے لئے

میں بھی خوش میرا خدا بھی خوش ہے تیرے درد سے
درد گو وجہ مصیبت ہے زمانے کے لئے

چھیڑ اگر منظور ہے ان کو تو باوصفِ حجاب
پھر وہ دیکھیں گے مجھے پھر مسکرانے کے لئے

چھوڑ کر وہ چل نہ دیں آخر زراہِ انتقام
مجھ کو تنہا رات دن آنسو بہانے کے لئے

وہ کہیں پوچھیں تو حسرت کس پہ مرتے ہو، کہ ہم
نام تک تیار ہیں اُس کو بتانے کے لئے

قسمتِ شوق آزما نہ سکے
ان سے ہم آنکھ بھی ملا نہ سکے

ہم سے یاں رنجِ ہجر اُٹھ نہ سکا
واں وہ مجبور تھے وہ آ نہ سکے

ڈر یہ تھا رو نہ دیں کہیں وہ اِنھیں
ہم ہنسی میں بھی گدگدا نہ سکے

ہم سے دل آپ نے اُٹھا تو لیا
پر کہیں اور بھی لگا نہ سکے

اب کہاں تم کہاں وہ ربطِ وفا
یاد بھی جس کی ہم دلا نہ سکے

دل میں کیا کیا تھے عرضِ حال کے شوق
اس نے پوچھا تو کچھ بتا نہ سکے

ہم تو کیا بھولتے انھیں حسرت
دل سے وہ بھی ہمیں بھلا نہ سکے

ہم عاشقِ فاسق تھے ہم صوفی و صافی ہیں
پی لیں جو کہیں اب بھی درخورد معافی ہیں

بیکار تھی ململ بھی گرمی میں شبِ فرقت
کام آئے گی جاڑے میں فردیں جو لحافی ہیں

عقلوں کو بنا دے گا دیوانہ جمال اُن کا
چھا جائینگی ہوشوں پر آنکھیں وہ غلافی ہیں

ہم شکرِ ستم کرتے کیوں شکوہ کیا اُن سے — آئینِ محبت کے شیوے یہ منافی ہیں
جھوٹی بھی گوارا تھی باقی بھی غنیمت ہے — دو گھونٹ بھی ساقی سے مل جائیں تو کافی ہیں
ہم اُن کی جفا سے بھی راضی تھے مگر ناحق — اب ہو کے وہ خود نادم سرگرمِ تلافی ہیں
جدّت میں ہے لاثانی حسرتؔ کی غزل خوانی — کیا طرفہ مطالب ہیں کیا تازہ قوافی ہیں

وجہ کیا خواب میں نہ آنے کی — شرم اُنھیں ہو نہ روٹھ جانے کی
رشک باقی ہے اب نہ کوئی رقیب — نہ ضرورت کسی بہانے کی
غیر ممکن ہے تیرے بعد ہوس — دل کسی اور سے لگانے کی
سُرمۂ چشمِ عیش تھی بخدا — خاک تیرے غریب خانے کی
مٹ گئیں آپ بھی مٹا کے مجھے — سختیاں خود بخود زمانے کی
اب نہ دل ہے نہ وہ ذخیرۂ شوق — توڑ دوں کنجیاں خزانے کی
یعنی کہنے کی ہے غرض نہ ہوس — اب کسی کو غزل سنانے کی
اُن کے بعد اب وہ کیا ہوئی حسرتؔ — دلفریبی ترے فسانے کی

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر — آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں — دل پہ ذوقِ شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
شرکتِ بزمِ سخن سے بھی ہمیں باوصفِ عزم — بر بنائے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

دردِ دل جو تھا کبھی وجہ مُباہات و شرف
بہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر

دل بھی پابندِ تمنّا ہے اسی دیدار کا
طور پر جو نور چمکا تھا جمالِ یار کا

عین دانائی ہے نادانی دیارِ عشق میں
کام ہر دیوانہ کرتا ہے یہاں ہشیار کا

طالبِ جنت ہوں کیوں افتادگانِ کوئے حُسن
تجربہ ہے جن کو تیرے سایۂ دیوار کا

بندۂ فرمانِ ساقی ہوں مجھے اے شیخ وقت
کس لئے ہو پاس تیری لاابد و نہار کا

مذہبِ عشاق ہے بیگانۂ قیدِ رسُوم
یاں نہیں حسرت بکھیڑا سبحہ و زنّار کا

سامنا اُن کے حُسنِ طلعت کا
سبب اچھا ہے میری حیرت کا

ختم کرتے ہو کیوں عطا پہ جفا
کچھ تو موقع رہے شکایت کا

یاد اُس بے خبر کی پھر آئی
پھر اُٹھا دل میں درد شدّت کا

ہو نہ جائے ہجومِ شوق میں گم
خوف ناصح تری ملامت کا

ہو جو حاصل ترِی محبّت میں
نام راحت ہے اس مُصیبت کا

کیا کریں ہم خلافِ رسمِ وفا
شکوہ اس یارِ بے مروّت کا

جانِ حُسنِ کلام ہے لاریب
سخنِ دل شکار حسرت کا

آپ کے حسنِ جہاں سوز کا جلوہ دیکھا
ہم نے گھر پھونک کے خوب آج تماشا دیکھا

کیا بتائیں دمِ نظّارہ بفرطِ حیرت
کیا نہ دیکھا رخِ زیبا میں ترے کیا دیکھا

دلربائی میں ترے حسن کو پایا بے مثل
جاں نوازی میں ترے ناز کو یکتا دیکھا

کھنچ گئی نورِ علیٰ نور کی تصویرِ جمیل
بعد کعبہ کے جو آنکھوں نے مدینہ دیکھا

ہم نہ کہتے تھے یہ لپکا نہیں اچھا حسرتؔ
خاک میں مل کے محبت کا نتیجا دیکھا

کیا ہو یہ آج پوچھیں گے اس نازنیں سے ہم
تجھ سا جو کوئی ڈھونڈھ نکالیں کہیں سے ہم

کہہ دے نہ اُن کے منھ پہ کہیں شوق پائے بوس
ڈرتے نہیں کچھ آپ کی چینِ جبیں سے ہم

کیا بات ہے ترے کرمِ فتنہ خیز کی
واقف ہیں اس خطاب عتاب آفریں سے ہم

تنہا نہ جاؤ چھوڑ کے ہم کو غمِ فراق
کیونکر اُٹھے گا پوچھ رہے ہیں تمہیں سے ہم

حسنِ بتاں سراجِ طریقِ صفا بنا
حق الیقیں تک آئے ہیں عین الیقیں سے ہم

ہمّت کا سر جھکا ہے درِ غوثِ پاک پر
پانا جو کچھ ہے پائیں گے حسرتؔ یہیں سے ہم

عاشق وہی کامل ہے جو رسوائے جہاں ہو
شاہد وہی احسن ہے جو بے نام و نشاں ہو

مقصود ہے پابندیٔ آئینِ محبت
زنہار اگر ہم کو سرِ سود و زیاں ہو

ایذا طلبِ عشق ہیں بیتاب کہ دیکھیں
کب طفل سے وہ شوخ جفا کار جواں ہو

بیمارِ غم آئے ہیں شفا پائیں تو جائیں
کیا ورنہ ہمیں تم جو مسیحائے زماں ہو

عارف ہے جو نظارۂ حق دل کو ہو منظور کافر ہے اگر شیفتۂ حسنِ بتاں ہو
تم دشمنِ عشاق بہر حال ہو یعنی آشوبِ نظر فتنۂ دل آفتِ جاں ہو
ہم کو تو بھی ملنا ہے وہیں خاک میں حسرت معلوم نہیں منزل جانانہ کہاں ہو

دن رات کی زق زق بق بق ہے دن رات کا رونا دھونا ہے
کیا تم نے یہ دل میں ٹھانی ہے معلوم نہیں کیا ہونا ہے
تم اور جو چاہو کام کرو، ناحق نہ ہمیں بدنام کرو
ہم اور تصورِ ترکِ وفا، ایسا تو ہوا ہے نہ ہونا ہے
کھیلے ہم کھیل محبت کا، انجام سے ہو کر بے پروا
معلوم نہیں کیا پانا ہے معلوم نہیں کیا کھونا ہے
تم ہم سے چھٹے کچھ ایسی گھڑی ملنے کی نہ پھر امید رہی
اب یاس کی آہیں بھرنا ہیں اور خون کے آنسو رونا ہے
کیا کہتے تھے حسرت اُن سے کبھی فرقت میں کیسے نیند آئے گی
حالانکہ وہ اب دنیا میں نہیں پھر بھی تمہیں ہر شب سونا ہے

بازار ہے گو غرب میں خوبانِ جہاں کا پر گل کی طرح حسن بھی کم بو ہے یہاں کا
غمزے ہیں وہ فطرت ہے نہ وہ ناز ہیں گرمی گم بردِ تصنع میں ہے سب جوش بیاں کا

عشاق کی جانب سے تقاضائے وفا پر — کہتے ہیں وہ جھگڑا یہ نکالا ہے کہاں کا
وہ گرم ہو یا سرد، وہ خوشبو ہو کہ خوش رو — منظورِ نظر ہے دلِ بے تاب و تواں کا
کیا کہئے کہ رہتا ہے بہر حال تصوّر — حسرتؔ ہمیں لندن کی اسی آفتِ جاں کا

آنکھ اس کی جو فتنہ بار اٹھی — ہر نظر الاماں پکار اٹھی
لے کے ہر جان کا شکیب جھکی — کر کے ہر دل کو بیقرار اٹھی
خیلِ خوبانِ شام سے وہ حسیں — بن کے سلمائے روزگار اٹھی
دین و ایماں کی اس کے خیر کہاں — جس کی جانب نگاہِ یار اٹھی
کر کے آخر وہ فتنہ پلتور[1] — دلِ حسرتؔ کا بھی شکار اٹھی

عیش میری شکستہ حالی کا — عکس ہے اُن کی بے ملالی کا
عہدِ عشرت بھی تیرے ساتھ وہ تھا — کیا زمانہ فراغ بالی کا
حسن تیرا بامتزاج وفا — اک نمونہ تھا بے مثالی کا
پھر وہ آمادۂ خرام ہیں مگر — پھر ہے مشتاق پائمالی کا
مہرباں ہو کے پاس کچھ تو کرو — لبِ حسرتؔ کی بے سوالی کا

چاہیں نہ کبھی دردِ محبت کی دوا ہم — کرتے ہیں جو پابندیِ آئینِ وفا ہم

---

[1] ٹورٹ کمپنی - بیروت

آزاد ترے شوق کا ہے جانِ تمنّا
کوئی کہے کچھ بھی اسے کہتے ہیں شفا ہم

آرائشِ گیسو میں ہے مشغول وہ بدخو
ایسے میں اسے چھیڑ کے دیکھیں تو بھلا ہم

کیا پائیں ترے جلوۂ مخمور کی لذّت
چکھ دیکھیں نہ جب تک یہ مئے ہوش رُبا ہم

خواہش کی باصرار یہ پرسش ہے تو کیوں ہے
ہم سے کہ بہر حال ہیں راضی برضا ہم

کر لیجئے کرنا ہے جو کچھ لُطف و مدارا
پھر گردشِ دوراں میں کہاں آپ کجا ہم

حریّتِ کامل کی قسم کھا کے اُٹھے ہیں
اب سایۂ برٹش کی طرف جائیں گے کیا ہم

گاندھی کی طرح بیٹھ کے کیوں کاتیں گے چرخہ
لینن کی طرح دیں گے نہ دُنیا کو ہلا ہم

اعلان کی تصدیق بسِ پُشت ہے حسرت
مُسلم ہیں تو دب کر نہ رہیں گے بخدا ہم

ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی
سنتے رہے رنگینیٔ ژوپا کی زبانی

آنکھوں کا تبسّم تھا مرے شوق کا موجب
چتون کی شرارت ہے مری دشمنِ جانی

ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ مُعنبر
جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی

ہوتی جو خبر اُس کو تو کیا کیا نہ بگڑتی
ژوپا نے غنیمت ہے کہ یہ بات نہ جانی

اٹلی میں تو کیا ہیں تو یہ کہتا ہوں کہ حسرت
دُنیا میں نہ ہوگا کوئی اس شکل کا ثانی

تمہارا ناز فرمانا بُرا ہے
ہمارا ہوش میں آنا بُرا ہے

ترا ہر بات پر اے حیلہ پرور
مرے سر کی قسم کھانا بُرا ہے

تکلّف سب سے کر اے جانِ محفل
مجھی سے تیرا شرمانا بُرا ہے
یہی کہہ دو کہ اب ملنا نہ ہوگا
یہ تڑپانا یہ ترسانا بُرا ہے
مری ہر دم کی بیتابی سے جل کر
وہ کہتے ہیں یہ دیوانا بُرا ہے
مرے دل سے ہے راضی غم تمہارا
نہ کہنا اب یہ کاشانہ بُرا ہے
یہی کہہ دے نہ اک دن اے ستمگر
تری حاجت کا برلانا بُرا ہے
وہاں بھی کیا نہیں اصنام پندار
تو کیوں مسجد سے بتخانہ بُرا ہے
ہرے ہو جائینگے سب داغ دل کے
ترا حسرت اُدھر جانا بُرا ہے

مُصیبت بھی راحت فزا ہو گئی ہے
تری آرزو رہنما ہو گئی ہے
یہ وہ راستہ ہے دیارِ وفا کا
جہاں بادِ صرصر صبا ہو گئی ہے
میں درماندہ اس بارگاہِ عطا کا
گنہگار ہوں اک خطا ہو گئی ہے
ترے رتبہ دانِ محبّت کی حالت
ترے شوق میں کیا سے کیا ہو گئی ہے
پہنچ جائیں گے انتہا کو بھی حسرت
جب اس راہ کی ابتدا ہو گئی ہے

ترے غم کی ناشادیاں چاہتا ہوں
محبّت کی بربادیاں چاہتا ہوں
میں اُس قید کی سرفرازی پہ نازاں
تمنّا کی آزادیاں چاہتا ہوں
میں ویرانۂ دل میں اس نورِ جاں کے
تصوّر کی آبادیاں چاہتا ہوں

ضمیمہ

از

سنہ ۱۸۹۴ء تا سنہ ۱۹۳۰ء

مجھے ہو خواہش بالِ ہما کیا / نہیں ہیں اُن کے کوچے کا گدا کیا
جو آنا ہے تو آؤ بے تکلّف / یہ عرضِ جلوۂ حیرت فزا کیا
نہیں ہے خاطرِ خرّم کی پروا / مجھے کم ہے دلِ درد آشنا کیا
نبھی بیمارئ اُلفت سے برسوں / کریں اب ہم تمنّائے شفا کیا
دلِ دقفِ الم ہاں پھر تو کہنا / وہ رنجِ ہجر کا ہے ماجرا کیا
نہ ہو مجھ سا کوئی محوِ تمنّا / ہُوا کرتی ہیں باتیں دل سے کیا کیا
گرایا پائے ساقی پر نشے میں / ترا اے لغزشِ پا پوچھنا کیا
یہ کہتا ہے مرا دستِ تمنّا / حیا اُن کی بنا لے گی مرا کیا
ہوا حسرت مجھے پھر شوقِ صحرا / جنوں نے پھر مجھے سمجھا دیا کیا

نہ ہوگی شفا چارہ گر دیکھ لینا
نہ جائے گا دردِ جگر دیکھ لینا
وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے
غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا
نہ بھولے گا وہ وقتِ رخصت کسی کا
مجھے مڑ کے پھر اک نظر دیکھ لینا
وہ شرمائی صورت وہ نیچی نگاہیں
وہ بھولے سے ان کا ادھر دیکھ لینا
کہاں ہم کہاں وصلِ جاناں کی حسرتؔ
بہت ہے انھیں اک نظر دیکھ لینا

میری نگہِ شوق کا شکوہ نہیں جاتا
سوتے ہیں بھی وہ پاس سے دیکھا نہیں جاتا
پاس اُن کے تصوّر میں بھی جایا نہیں جاتا
سر سے قدمِ ناز لگایا نہیں جاتا
جا کر کوئی اس محو تغافل سے یہ کہدے
اب تو دلِ بیتاب سے تڑپا نہیں جاتا
کرتے تھے کبھی حوصلۂ ترکِ محبت
اب صدمۂ دوری بھی اٹھایا نہیں جاتا
اصرار نہ احباب کریں سیرِ چمن کا
میں کشتۂ دوری ہی نہیں جاتا نہیں جاتا
اب اس کو تغافل نہ کہوں میں تو کہوں کیا
کیا خواب میں بھی آپ سے آیا نہیں جاتا
اُمید نہیں ان سے ملاقات کی ہر چند
آنکھوں سے مگر شوقِ تماشا نہیں جاتا
گھبرا کے کہا صبر نے بیتابیِ دل سے
اب مجھ سے دلِ زار میں ٹھہرا نہیں جاتا
واللہ تجھے چھوڑ کے اے کوچۂ جاناں
حسرتؔ سے تو فردوس میں جایا نہیں جاتا

تصوّر میں بھی اُن کے کچھ عجب عالم نکلتا ہے
اسی پر تو مری حیرانیوں کا دم نکلتا ہے

وہ ظاہر میں عبث دلدادہ بیگانہ خوئی ہیں — کہیں دل سے خیالِ الفتِ باہم نکلتا ہے
دلِ مایوس میں ہوتا ہے خونِ آرزو حسرت — وہی آنکھوں سے بن کر اشکِ غم پیہم نکلتا ہے

بے تاب نظر آیا، بدنام نظر آیا — عاشق جو نظر آیا ناکام نظر آیا
ناکامئ ہجراں نے یہ رنگِ جہاں بدلا — جو صبح کا جلوہ تھا سو شام نظر آیا
اے آہِ دلِ عاشق دیکھیں تری تاثیریں — پہلے سے بھی وہ بڑھ کر خودکام نظر آیا
اللہ ری محرومی اللہ ری ناکامی — جو شوق کیا ہم نے سو خام نظر آیا
اس شغل سے آنکھوں کو دم بھر جو نہیں فرصت — رونے میں وہ کیا ایسا آرام نظر آیا
ہم جس کو سمجھتے تھے سرمایۂ آزادی — وہ عشقِ بتاں آخر اک دام نظر آیا
رسوائی کی گلیوں میں پھرتا ہے پڑا حیراں — یہ عشق کا حسرت کے انجام نظر آیا

موسمِ گل میں وہ چلنا بادِ عشرت خیز کا — یاد ہیں وہ مستیاں وہ توڑنا پرہیز کا
ہم نے دیکھا ہے جنوں شوریدگانِ شوق کا — مت سنا واعظ فسانہ شورِ رستاخیز کا
سینکڑوں کو کر دیا دل باختہ جاں باختہ — ہائے عالم اس کی رفتارِ قیامت خیز کا
وہ بگڑنا بھی کبھی مجھ سے تو مننے کے لئے — یاد ہے انداز تیرے جورِ لطف آمیز کا
پیروِ تسلیم ہوں شیدائے اندازِ نسیم — شوق ہے حسرت مجھے اشعارِ حسرت خیز کا

کیا پوچھتے ہو عاشقِ بیمار کا مزاج
آہ اس فدائے لذّتِ آزار کا مزاج

شاید تم اپنے ہاتھ سے دو گے اُسے سزا
ہے عرش پر تمہارے گنہگار کا مزاج

عادت اُسے بھی ہو گئی رُونے کی بے سبب
میرا سا ہو گیا مرے غمخوار کا مزاج

کس کس کا خون آج نہ ہو جائے دیکھئے
بگڑا ہوا ہے یار کی تلوار کا مزاج

میرا نشاں مٹائے تامل ہے اسمیں کیوں
اللہ ری اُن کی شوخیٔ رفتار کا مزاج

وہ اور دیکھے عاشقِ بیکس کے حال کو
کس نے بدل دیا نگہِ یار کا مزاج

میں کیا کہوں کہ شرم سے کیسے جھکا کے سر
پوچھا انھوں نے حسرتِ بیمار کا مزاج

گذر گئی حد سے پائمالی عتاب ترکِ کلام کب تک
رہے گی مسدُود اے ستمگر رہ پیام و سلام کب تک

بہت ستاتی ہے اس کی دُوری تلافیٔ غم بھی ہے ضروری
ہو جلد صبحِ وصال یارب رہیگی فرقت کی شام کب تک

مرید پیرِ مغاں ہوں آخر مجھے خطر کیا ملامتوں کا
خیالِ ناموس و ننگ چھوڑوں رہے گی پروائے نام کب تک

قفس میں صیّاد بند کر دے نہیں تو بے رحم چھوڑ ہی دے
میانِ امیّد و بیم آخر رہیں گے ہم زیرِ دام کب تک

اگرچہ خود دلفگار بھی ہیں مگر تغافل شعار بھی ہیں
وہ کر چکے تجھ پہ لطف حسرت یہ آرزو ہائے خام کب تک

اللہ ری مزاج کی حسرت پرستیاں
گویا کہ آشنا ہی نہیں ہیں ہنسی سے ہم

ہمدردیٔ الم سے بڑھا اور بھی الم
باز آئے ہمنشیں تری اس دوستی سے ہم

کیا پوچھنا ہے لطفِ الم ہائے شوق کا
ملتے ہیں ایسے رنج سے بھی کس خوشی سے ہم

وہ بر سرِ جفا ہیں تو ہم مائلِ وفا
تنگ آ گئے ہیں شوق کی دل بستگی سے ہم

ابرِ بہار ہیں نہ ہوائے جناں رہی
یعنی نہ ہاتھ کھینچ سکے مے کشی سے ہم

ملتا نہیں جو ہوش کا اپنے کہیں پتہ
اب اس کا حال پوچھیں گے وارفتگی سے ہم

کس درجہ دل پذیر ہے حیرانیٔ جنوں
فارغ ہیں شوقِ عزتِ فرزانگی سے ہم

حسرت ہیں وقفِ پیرویٔ مومن و نسیم
کیوں سلسلہ ملائیں کسی لکھنوی سے ہم

زاہدوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ میخواروں میں ہوں
بیخودِ سحرِ دو جہاں ہوں تیرے سرشاروں میں ہوں

بیخودی ہائے محبت کا نہ پوچھو حال کچھ!
بے خبر ظاہر میں ہوں باطن میں ہشیاروں میں ہوں

دردِ الفت سے نہیں واقف مگر کیا کم ہے یہ
عاشقانِ درد کے میں کفش برداروں میں ہوں

اے خوشا قسمت شرابِ بیخودی کا ہوں خراب
اے زہے تقدیر ان آنکھوں کے بیماروں میں ہوں

بیوفائی مجھ کو کیا معلوم کہتے ہیں کسے
وہ مری سرکار ہیں ان کے وفاداروں میں ہوں

لے گئی ہے بیخودی کیا جانے مجھ کو کہاں
میں نہیں ہوں محفلِ یار میں گو یاروں میں ہوں

بیخودی میں کیا ہوا کرتا ہے کیا جانے کوئی
سب سمجھتے ہیں یہی مجھ کو کہ بیکاروں میں ہوں

خفتہ بختانِ محبت کا یہ کہنا ہے نصیب
ظاہراً سوتا ہوں میں باطن میں بیداروں میں ہوں

نام آزادی زباں پر میری حسرت آئے کیوں
کہ آخر دامِ الفت کے گرفتاروں میں ہوں

بسر کی عمر ساری کوئے جاناں کی گدائی میں
بلا جانے مری کیا ہیں عزے فرماں روائی میں
نہیں معلوم یہ کس کعبۂ ارماں کی چوکھٹ ہے
کہ سر اپنا جھکا جاتا ہے شوقِ جبہ سائی میں
خیالِ یار سے تسکینِ خاطر ہو تو ہو شاید
تسلّی اور دے گا کون شبہائے جُدائی میں
رہے بیکس نوازی وہ دلِ بیمار پر میرے
نہیں کرتے ستم مشہور ہیں گو کج ادائی میں
جوابِ نامہ ہائے شوق سے محروم ہیں حسرت
جفائیں ہو رہی ہیں پر وہ صبر آزمائی میں

ترکِ ہوسِ زلف چلیپا نہیں ممکن
اب جائے مرے سر سے یہ سودا نہیں ممکن
پھر اور تغافل کا سبب کیا ہے خدایا
میں یاد نہ آؤں انھیں ایسا نہیں ممکن
تسکین سے بڑھتی ہے جلن اور بھی دل کی
یعنی تپشِ غم کا مداوا نہیں ممکن
نقشِ قدمِ یار کو بھی پاسِ ادب ہے
مثلِ کفِ پا سر سے لگانا نہیں ممکن
کب تک دلِ مضطر نہ کرے درد سے فریاد
اب اے ستمِ صبر تقاضا نہیں ممکن
اس بیخودیٔ شوق کی ہو کس سے شکایت
وہ سامنے ہیں پھر بھی تقاضا نہیں ممکن
جنّت کی تمنّا ہو ترے کوچے کے ہوتے
حسرت سے یہ اے حور سراپا نہیں ممکن

حواسِ خرد سے بہت دور ہوں میں
شرابِ محبّت کا مخمور ہوں میں

ہمہ در پئے لطفِ رندی و مستی
تمنائی عیشِ موفور ہوں میں

لگی ہے مرے لب پہ مہرِ خموشی
مگر واقفِ سرِّ مستور ہوں میں

دکھا دوں مزا اُن کو ان کے ستم کا
مگر پاسِ اُلفت سے مجبور ہوں میں

خراباتیانِ محبت کا بندہ
وہی حسرتِ رندِ مشہور ہوں میں

فصلِ بہار آئی ہے جوشِ گلِ چمن میں
اک دھوم سی مچی ہے مستانِ نعرہ زن میں

سیکھی تھی خود فروشی مکتب میں آرزو کے
پاتے ہیں درس حیرت اُس بت کی انجمن میں

تیری نزاکتوں کی اے نازکی سراپا
تشبیہہ گل میں پائی ہم نے نہ یاسمن میں

دیوانہ کر دیا ہے یہ کس کی آرزو نے
چرچا ہے کس صنم کا ہر شیخ و برہمن میں

توڑے گی فصلِ گل کیا پیمانِ پارسائی
جاں آ چکی ہے پھر کچھ اک خواہشِ کہن میں

اس جانِ مضطرب کو کیونکر قرار آئے
آفت کی شوخیاں ہیں اُس حسنِ سحر فن میں

واں حیرتِ محبت کچھ دیکھنے نہ دے گی
جائے کو یوں تو حسرت جائے اُس انجمن میں

میں ہوں اے زلفِ سیہ تیرے پریشانوں میں
نام میرا بھی لکھا ہے ترے دیوانوں میں

دستِ نازک سے تو قاتل کے نہ اُٹھی تلوار
اور رہا نام مرا مفت گراں جانوں میں

کوئی سرخوش ہے کوئی مست ہے، کوئی ہے خراب
میکشوں کے بھی عجب رنگ ہیں میخانوں میں

کر دیا جس نے مجھے دونوں جہاں سے غافل
ایسی کیا شے تھی وہ ساقی ترے پیمانوں میں

گھر کے ارمانوں میں کہنا وہ تصوّر کا ترے
ہائے یہ مجھ کو کہاں لائے ہیں بیگانوں میں

یادِ ایّام کہ ہم جوشِ جنوں میں حسرت
خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

مضطر ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے
دیکھی جو نہیں آپ کی صورت کئی دن سے

میخانے سے محروم چلے آتے ہیں یوں ہی
ہوتی نہیں ساقی کی عنایت کئی دن سے

چھیڑے ہے مجھے پھر خلشِ خارِ محبّت
بیچین ہے پھر میری طبیعت کئی دن سے

مجھ سا بھی نہ ہو محوِ تصوّر کوئی یعنی
ملتی نہیں رونے کی بھی فرصت کئی دن سے

کہتے ہیں جنوں بیخودیِ عشق کو احباب
سنوائے ہے کیا کیا مری حیرت کئی دن سے

کس فتنۂ محشر نے کیا وصل سے انکار
برپا ہے مرے دل میں قیامت کئی دن سے

ہے ناک میں دم اور بھی بیچین ہوں حسرت
کرتے ہیں جو احباب نصیحت کئی دن سے

ہزاروں بار نکلے اشک لیکن پھر بھی کم نکلے
الٰہی اور کیسے آرزوئے چشمِ نم نکلے

خرامِ ناز سے مردے ہزاروں ہو گئے زندہ
مسیحا سے بھی بڑھ کر تیرے اندازِ قدم نکلے

ہزاروں بار چھیڑا جوششِ غمہائے فرقت نے
ہزاروں بار آنسو آپ کے سر کی قسم نکلے

کیا پھر جذبۂ بے اختیارِ شوق نے واپس
ابھی ہم کوچۂ جاناں سے تھے دو ہی قدم نکلے

رہے کوئی کہاں تک کشمکش ہائے محبّت میں
نہ غم جائے نہ نکلیں حسرتیں دل کی نہ دم نکلے

جفائے ناروائے یار بھی اک لطفِ پنہاں ہے
کہیں تجھ سے نہ اے دل دیکھنا ذوقِ ستم نکلے

خیالِ خاطرِ احباب سے رہتے تھے خوش حسرتؔ
حقیقت میں گرفتارِ غم و رنج و الم نکلے

جفا تیری بہت اے بے مروت بڑھتی جاتی ہے
ہمیں بھی خواہشِ ترکِ محبت بڑھتی جاتی ہے

اُدھر جرمِ محبت پر وہ برہم ہوتے جاتے ہیں
اِدھر دل میں تمنائے شہادت بڑھتی جاتی ہے

وہ اظہارِ وفا پر بھی جفائیں کرتے جاتے ہیں
دلِ وقفِ ندامت کی ندامت بڑھتی جاتی ہے

بظاہر اُن میں گو خوئے تغافل آتی جاتی ہے
مگر ہے یوں کہ اُن کو مجھ سے اُلفت بڑھتی جاتی ہے

سکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ لطفِ جاناں نے
مرے دستِ تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے

جمالِ یار میں ہر دم ترقی ہوتی رہتی ہے
دلِ حیراں کی حسن سے روز حیرت بڑھتی جاتی ہے

طبیعت خوگرِ دردِ محبت ہوتی جاتی ہے
تمہارے جورِ بے پایاں کی لذت بڑھتی جاتی ہے

اِدھر شب کو وہ محوِ خوابِ راحت ہوتے جاتے ہیں
اُدھر آنکھوں کو پابوسی کی حسرت بڑھتی جاتی ہے

بہار آئی ہے ساقی بادۂ گلگوں پلانا بھی
کہاں کی پارسائی کیسی توبہ جام لانا بھی

ہوا کیا فائدہ ناصح نصیحت ہائے بیجا سے
مرا سر کس لئے کھایا بھلا کچھ میں نے مانا بھی

ستم کیا کیا نہ ہوں گے پردۂ صبر آزمائی میں
انھیں جور و جفا کا مل گیا اب تو بہانا بھی

بدل دی اُنکی عادت صحبتِ اغیار نے کیسی
کہ اُن کو آگیا دل ہائے مضطر کا ستانا بھی

یہ حالت انتہائے ضعف نے کر دی مری آخر
کہ جوشِ غم سے اب ممکن نہیں آنسو بہانا بھی

وہ آغازِ محبت میں کرم اُن کا وفا اُن کی
رہے گا یاد حسرتؔ ہم کو برسوں وہ زمانا بھی

فکر سے تو نہ ہوا وصل کا ساماں کوئی
تو ہی تدبیر بتا اے دلِ ناداں کوئی

وصل میں نذر نہیں درخورِ جاناں کوئی
بیخودِ شوق سے ہوتا نہیں ساماں کوئی

ہم نے بھی شکوۂ بیداد کی کھائی ہے قسم
دیکھیو جور کا رہ جائے نہ ارماں کوئی

موسمِ گل میں عجب رنگ ہیں دیوانوں کے
پاک داماں ہے کوئی چاک گریباں کوئی

رہ نوردانِ جنوں سے اسے پوچھو حسرت
جانے کیا مرتبۂ خارِ مغیلاں کوئی

تاثیر صبر کی ہے نہ میری دعا کی ہے
وہ مائلِ وفا ہیں یہ قدرت خدا کی ہے

دل میں بھی اپنے جور سے نادم نہیں ہو تم
سچ سچ کہو ستم تمہیں میری وفا کی ہے

کربِ شبِ فراق سے دیتا نجات کون
جانِ نزار پہ یہ عنایت قضا کی ہے

سنتے ہیں آج کل ہیں وہ پھر مائلِ جفا
تقدیر اوج پر دلِ درد آشنا کی ہے

حسرت غلام شافعِ روزِ شمار ہے
کب اس کو فکر پرسشِ روزِ جزا کی ہے

رنجِ ہجراں میں قیامت کا مزا ہوتا ہے
دردِ الفت بھی غضب عیش فزا ہوتا ہے

جا چکا سر سے مرے عشقِ بتاں کا سودا
اب کوئی لاکھ بھی سمجھائے تو کیا ہوتا ہے

خوگرِ ہجر کو ہوتی ہے تڑپ سے تسکیں
دردِ خود دردِ محبت کی دوا ہوتا ہے

چشمِ جاناں کے ہیں دنیا سے نرالے انداز
جب نظر کرتی ہے اک لطف نیا ہوتا ہے

وہ خفا ہیں کہ دعا بھی تھی شکایت میری
میں ہوں محجوب کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

شکوۂ غم نہ کیا ہے نہ کروں گا حسرت ۔۔۔ اس میں بے مہریٔ جاناں کا گلا ہوتا ہے

حسرتِ زار کو یارانِ وطن بھول گئے ۔۔۔ مرغِ پابند کو مرغانِ چمن بھول گئے

ہم نے تکلیفِ محبّت میں وہ راحت پائی ۔۔۔ کہ طریقِ گلۂ رنج و محن بھول گئے

خوبروئی تری مشہور ہوئی عالم میں ۔۔۔ لوگ افسانۂ عذرا و دمن بھول گئے

نہ ملیں گے دلِ بیتاب کرے لاکھ اصرار ۔۔۔ ہم بھی جا اب تجھے اے عہد شکن بھول گئے

غلبۂ درد سے ہیں درد سراپا اشعار ۔۔۔ یعنی ہم پیرویٔ اہلِ سخن بھول گئے

ایک ہمدردیٔ رسوا تھی انہیں حسرت ۔۔۔ سو وہ رسوا بھی اُسے جا کے دکن بھول گئے

کرنے لگے کرم کے عوض کج ادائیاں ۔۔۔ وہ وعدہ ہائے لطفِ فراواں کدھر گئے

وہ برسرِ کرم ہیں تو ہم ہوش میں نہیں ۔۔۔ یارب ہمارے دل کے سب ارماں کدھر گئے

اب تک درِ قبول سے نالے پھرے نہیں ۔۔۔ کیا جانئے کہ ہو کے پشیماں کدھر گئے

حسرت جفائے یار کی کیوں ہیں شکایتیں ۔۔۔ پاسِ وفا کے وہ ترے پیماں کدھر گئے

جھوم جھوم آنے لگا ابرِ بہاری دیکھئے ۔۔۔ کب تلک باقی رہے پرہیزگاری دیکھئے

پھر ہے اُس بیدادگر سے شوق عرضِ آرزو ۔۔۔ خاطرِ ناکام کی بے اختیاری دیکھئے

ہے تمنّا دل میں اب تک اک نگاہِ لطف کی ۔۔۔ جور اپنا دیکھئے حسرت ہماری دیکھئے

جوشِ گل کے ساتھ پھر جوشِ جنوں گھٹنے لگا
اٹھ چلی دنیا سے رسمِ ہوشیاری دیکھئے

یار سے خط و کتابت تھی سو وہ بھی اب نہیں
بخت ناہموار کی ناسازگاری دیکھئے

ناز بردارِ الم لکھا ہے نامے میں مجھے
اس سراپا ناز کی مضموں نگاری دیکھئے

خاطرِ محروم کا اللہ رے پاسِ وفا
ہے ابھی تک مائلِ امّیدواری دیکھئے

حالِ دل پر آ گئی تھی کچھ ہنسی سو ہجر میں
حسرتِ محوِ الم کی شرمساری دیکھئے

ضمیمہ الف

سنہ ۴۱ء و سنہ ۴۲ء

پھر آنے لگیں شہرِ محبت کی ہوائیں ‏ پھر پیشِ نظر ہو گئیں جنت کی فضائیں
اے قافلے والو! کہیں وہ گنبدِ خضرا ‏ پھر آئے نظر ہم کو کہ تم کو بھی دکھائیں
ہاتھ آئے اگر خاک ترے نقشِ قدم کی ‏ سر پر کبھی رکھیں کبھی آنکھوں سے لگائیں
نظارہ فروزی کی عجب شان ہے پیدا ‏ یہ شکل و شمائل، یہ عبائیں یہ قبائیں
کرتے ہیں عزیزانِ مدینہ کی جو خدمت ‏ حسرتؔ انھیں دیتے ہیں سب دل سے دعائیں

دل ہے نازاں کہ تری صورت زیبا دیکھی ‏ آنکھ حیران کہ اک حسن کی دنیا دیکھی
پہلے آنکھیں ہوئی گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح ‏ چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی

بدگماں مجھ سے بھی کیوں غیر کے مانند ہوئے
مجھ کو دیکھا نہ مرے دل کی تمنا دیکھی

فطرتِ حسن ہے بیباک، مگر ہم نے یہاں
تیری شوخی میں بھی اک شانِ محابا دیکھی

زلفِ شب رنگ پہ گلنار لباسی کی بہار
آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھی

کس درجہ دل پسند ہے کوشش یہ خواب کی
آئینہ دار آپ کے حسنِ شباب کی

کرتی ہے دل کو اور بھی آمادۂ ہوس
تیری یہ بے رُخی یہ ادا اجتناب کی

اہلِ نظر سے آپ کو لازم نہ تھا حذر
ہوتی ہے اہلِ فسق سے حاجت حجاب کی

کچھ ان کو قدرِ شوق نہیں، ورنہ آرزو
امیدوار تھی کرمِ بے حساب کی

حسرت وہ بے نیازِ محبت ہیں، کچھ انھیں
اب تک خبر نہیں ترے حالِ خراب کی

پھر کہاں دل رہے کہاں نہ رہے
جب تمہیں اس پہ مہرباں نہ رہے

خود غرض عشق، خوفِ حسن کو بھی
چاہتا ہے کہ درمیاں نہ رہے

دل شکن کیوں بنو، ہمارے لئے
تم یہ مانا کہ دل ستاں نہ رہے

یاس بہتر ہے، دیکھ او بے مہر
آرزو کوئی نیم جاں نہ رہے

مان لیں پیر ہم بھی حسرت کو
عشقِ حسرت اگر جواں نہ رہے

نہ پوچھو خاطرِ بسمل میں کیا ہے
یہ خود سوچو تمہارے دل میں کیا ہے

پناہِ جہدِ پیہم ہو، تو خطرہ
فریبِ دوریٔ منزل میں کیا ہے
ہوس مجرم ہے، پر لوثِ گنہ کے
تمہارے دعوئ باطل میں کیا ہے
سزا دو گے ہمیں کب تک کہاں تک
خدا جانے تمہارے دل میں کیا ہے
دُعا کر وہ ملیں خود، ورنہ حسرت
تری اس سعی بے حاصل میں کیا ہے

ہر سمت مری چشمِ تمنّا نگراں ہے
معلوم نہیں جلوۂ جانانہ کہاں ہے
شاید یہ وہی ہے جو مرے شوقِ نظر کے
باطن میں تو موجود ہے ظاہر میں نہاں ہے
عاشق جسے کہتا ہے محبّت کا فریضہ
بدعت کا اسی چیز پہ زاہد کا گماں ہے
کونین کی راحت سے بھی زنہار نہ بدلے
دل ذرّۂ محبّت کا ترے مرتبہ داں ہے
حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا
گو اُس کی نظر شیفتۂ حسنِ بتاں ہے

طالب ہوں فیضِ غم کا اک حسنِ بے نشاں سے
دستِ سوال میرا اونچا ہے آسماں سے
اظہارِ آرزو کی آئی نہ اُن سے نوبت
دل نے دریغ رکھا اُس راز کو زباں سے
اک طرفہ ماجرا ہے، باوصفِ خود نمائی
قصدِ حذر کسی کا انبوہِ عاشقاں سے
عشقِ بتاں ہے بیشک تمہیدِ حق پرستی
رقبہ ہے ملکِ دل کا ملحق دیارِ جاں سے
حسرت کو عاشقی میں تھا زعمِ پختہ کاری
پھر بھی شکست کھائی اس شوخ نکتہ داں سے

قیمتِ مے کہ بہ پیمانۂ جاں ہے ساقی
کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے ساقی

للہ الحمد کہ رندوں میں علی الرّغم حسود
سکۂ فیض ترا اب بھی رواں ہے ساقی

تشنہ کامانِ مئے ناب ہیں جاں بر لبِ شوق
کرم اب بھی نہیں دشوار کہاں ہے ساقی

تو نے رکھ دی تھی جہاں چھین کے ہم سے بوتل
رُوحِ مستی اُسی جانب نگراں ہے ساقی

دل ہے کس مے کا طلب گار خدا ہی جانے
کیا یہیں سے ہے کہ بے نام و نشاں ہے ساقی

تو ہے فیاض تو پھر فیض میں کیوں دیر اتنی
دے کہیں جلد کہ مجھ کو خفقاں ہے ساقی

مُحتسب کی نہ سنی ہے نہ سُنے گا حسرت
کہ وہ میخوار ترا مرتبہ داں ہے ساقی

گرویدہ اہل شوق جو حسنِ بتاں کے ہیں
شاید یہ سب نشانے اُسی بے نشاں کے ہیں

سجدے جبینِ اہلِ عقیدت کے فی المثل
سب سنگِ نور ہیں جو ترے آستاں کے ہیں

اب دل میں ہے کہ صرف ترے ہو کے بیٹھ جائیے
قضیے چکا کے سب جو زمین و زماں کے ہیں

اب یہ بھی ہے قریب کہ مٹ جائیں یک قلم
سینے میں داغ جتنے غمِ دلبراں کے ہیں

حسرت وہ سُن رہے ہیں جو اہلِ وفا کا حال
اس میں بھی کچھ فریب تری داستاں کے ہیں

حصّہ سیزدہم

از

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء تا دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء

نہ مرنے کی باتیں نہ جینے کی باتیں — کرو ہمصفیرو مدینے کی باتیں
علیؑ باب علم اس سے ٹھہرے کہ اُن کو — نبیؐ نے بتائی تھیں سینے کی باتیں
شریعت ہوئی نردبانِ حقیقت — یہ ہیں بامِ عرفاں کے زینے کی باتیں
مٹائے محبّت نے سب عیب اب یاں — نہ بغض و حسد ہے نہ کینے کی باتیں
بڑا چور ہے نفسِ امّارہ حسرتؔ — نہ سُننا کبھی اُس کمینے کی باتیں

جہاں تک ہم اُن کو بھُلاتے رہے ہیں — وہ کچھ اور بھی یاد آتے رہے ہیں
انھیں حال دل ہم سُناتے رہے ہیں — وہ خاموش زلفیں بناتے رہے ہیں
محبّت کی تاریکیٔ یاس میں بھی — چراغِ ہوس جھلملاتے رہے ہیں

جفا کار کہتے رہے ہیں جنھیں ہم
اُنھیں کی طرف پھر بھی جاتے رہے ہیں
وہ سوتے رہے ہیں الگ ہم سے جب تک
مُسلسل ہم آنسو بہاتے رہے ہیں
بگڑ کر جب آئے ہیں اُن سے تو آخر
اُنھیں کو ہم اُلٹے مناتے رہے ہیں
وہ سُنتے رہے مجھ سے افسانۂ غم
مگر یہ بھی ہے مُسکراتے رہے ہیں
نہ ہم ہیں نہ ہم تھے ہوس کار حسرتؔ
وہ ناحق ہمیں آزماتے رہے ہیں

ہر لحظہ ہے رُسوائی کونین کا دھڑکا
ہر ساعتِ شوق اپنی قیامت کی گھڑی ہے
پہلے تو کرم خود ہی کیا تم نے پھر اب کیوں
آنکھوں سے لگی اشکِ ندامت کی جھڑی ہے
ہم کو یہ تری برہمیِ مرحمت آلود
کیونکر نہ گوارا ہو کہ پھولوں کی چھڑی ہے
کیا حُسن پرستی بھی کوئی عیب ہے حسرتؔ
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے

چادر جو کہیں حسنِ رُخِ یار کی سرکی
قابو میں طبیعت نہ رہی ذوقِ نظر کی
سوتے میں جو دیکھا تھا رُخِ یار کا عالم
آنکھوں میں یہ خُنکی ہے اسی نورِ سحر کی
ہے شوق بھی دیوانہ ترے نقشِ قدم کا
مائل ہے عقیدت بھی ترے سجدۂ در کی
لغزش سی جو ہے اس کے قدم میں دمِ رفتار
یہ ناز کی مستی یہ نزاکت ہے کمر کی
چاہا تھا کہ پھر اُن کو نہ چھیڑیں گے پہ چھیڑا
خواہش کوئی بھی اُن سے نہ کرنی تھی مگر کی

آجاتی ہے ناگاہ جدائی کی مصیبت — ہوتی ہے خبر کس کو ترے عزمِ سفر کی
یا حسن ہے یا عشق ہر اک نقش یہاں کا — کیا بات ہے اے شوخ تری راہ گذر کی
کیا فائدہ حسرت نہ ہوا ضبط ہوس کا — پوشیدہ محبت نہ رہی "وحشؔ" بسر کی

اس شوخ کو رسوا نہ کیا ہے نہ کریں گے — ہم نے کبھی ایسا نہ کیا ہے نہ کریں گے
محفوظ ہے یہ راز ترے لطفِ ستم کا — اغیار میں چرچا نہ کیا ہے نہ کریں گے
بولے تو یہ بولے وہ تقاضائے کرم پر — یوں ہی سہی اچھا نہ کیا ہے نہ کریں گے
نسبت ہے تعارف کی جو اُن سے وہ رہیگی — تخصیص کا دعویٰ نہ کیا ہے نہ کریں گے
اغیار کے قابو میں بھی یہ قول ہے اُن کا — حسرت سے تو پردہ نہ کیا ہے نہ کریں گے

آشنا جب سے وہ بدخو، وہ ستمگار ہوا — فتنہ بیدار ہوا
جان و دل سے ہوئی دل جان سے بیزار ہوا — صبر دشوار ہوا
اب نہ دُنیا کی تمنا ہے نہ عقبیٰ کی ہوس — اک ترا شوق ہے بس
دل جو اے جانِ جہاں تیرا طلبگار ہوا — سب سے بیزار ہوا
دل کو حاصل ہوئی افکارِ دو عالم سے نجات — بن گئی خواب یہ بات
چھوٹ کر سب سے تری قید کا اقرار ہوا — اور یہ اصرار ہوا
بے وفائی کا جو خطرہ تھا وہ پیش آکے رہا — تجھ سے اے محوِ جفا

لطف کا شکوہ غم پر بھی نہ اظہار ہوا
صاف انکار ہوا
ہم نے حسرت کی سفارش تو بہت کی تھی مگر
نہ ہوا کچھ بھی اثر
پہلے بیگانہ جو تھا اب وہ دلِ زار ہوا
یارِ اغیار ہوا

محبت کے اثر کی طرفہ سامانی نہیں جاتی
خود اُن سے اپنی صورت اب تو پہچانی نہیں جاتی
غلط ہے دعوئ عرفانِ حق اربابِ حکمت کا
حقیقت اُن سے جو بھی جاتی ہے جانی نہیں جاتی
ہوس کے حوصلے ہیں پست دنیائے محبت ہیں
نگاہِ آرزو کی پاکی دامانی نہیں جاتی
یہ آخر کیا قیامت ہے کہ باوصفِ خردمندی
ہوس کے معرکوں میں دل کی نادانی نہیں جاتی
مری مظلومیاں بھی ظلم ٹھہری ہیں نہ کیوں ٹھہریں
کہ اب اس جورِ نادم کی پشیمانی نہیں جاتی
طلبگارِ وفائے حُسن ہے عشقِ ہوس پرور
یہ خو جاتی تو ہے لیکن باآسانی نہیں جاتی
وفا کی ہم نے حد کردی جو اُن کے جورِ پیہم پر
وہ اب حیرانِ غم ہیں ان کی حیرانی نہیں جاتی
زوالِ نور لازم ہے مجازی حُسنِ خوباں کو
وہ مطلق حُسن ہے جس کی درخشانی نہیں جاتی
سویت آپ کا مقصد بغاوت آپ کا مسلک
مگر اس پر بھی حسرت کی غزل خوانی نہیں جاتی

وہ رخصت سب سے ہو کر جا رہے ہیں
قیامت کا سماں دکھلا رہے ہیں
احبا بھر رہے ہیں سرد آہیں
اعزا اشکِ غم برسا رہے ہیں
مخاطب سب سے ہیں اک وہ مجھی سے
بظاہر بے رُخی فرما رہے ہیں

اب آئیں گے کبھی کاہیکو یاں ہم — یہ دھمکی بھی وہ دیتے جا رہے ہیں
یہ خفگی ہی نہ نکلے، جس کو حسرت — لگاوٹ اب بھی ہم ٹھہرا رہے ہیں

دل اُن سے مِل کے اب اُن کو بھلا نہیں سکتا — مگر یہ کیوں ہے میں خود بھی بتا نہیں سکتا
بقدرِ حوصلۂ عاشقی ہے شوقِ وصال — مگر وہ شوق جو دِل میں سما نہیں سکتا
ستم یہ کِس کے تغافل کا ہے مِرے دل میں — میں پھر سے شوق کی دُنیا بسا نہیں سکتا
یہ کِس کے عجزِ تمنّا کا پاس ہے کہ وہ شوخ — بہ زعمِ ناز بھی دامن چھُڑا نہیں سکتا
تری نظر کا ہے ناوک وہ ناوکِ دلدوز — نشانہ کوئی بھی جس کا بچا نہیں سکتا
انھیں یقین محبّت نہیں غضب تو یہ ہے — کہ چیر کر میں دل اپنا دِکھا نہیں سکتا
اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت — جو کوئی پوچھے کہاں ہے بتا نہیں سکتا

اشارت دل ربا ہو گی، کنایت دل نشیں ہو گی
تعلّق حسن سے جس شے کا ہو گا نازنیں ہو گی

میسّر جس کو ہو گا فخر تیرے خیر مقدم کا
وہ دن راحت فزا ہو گا وہ شب عیش آفریں ہو گی

عنایت کی نظر کا جب تقاضہ اُن سے ہوتا ہے
وہ کہتے ہیں نہیں ہو گی، نہیں ہو گی، نہیں ہو گی

ستم کھانے کے قابل کیوں نہ ہو گی اُس کی خوش بختی
محبّت جس کے دل میں آپ کی خلوت گزیں ہو گی
نشانِ آستانِ حُسن ہو گا جس طرف حسرتؔ
اسی جانب کمالِ شوق کی مائل جبیں ہو گی

نہ وہ بولے نہ ہم روئے پھر آخر
اُٹھے کیونکر حجابِ درمیانی
خطابِ حُسن اُدھر تھا بے خطابی
زبانِ عشق اِدھر تھی بے زبانی
وہ یک سر بے نیازِ عاشقاں ہیں
قیامت ہے یہ شانِ دل ستانی
پھرا قاصد مرا اس در سے ناکام
نہ خط آیا نہ پیغامِ زبانی
نہ فرق آیا تری بے مہریوں میں
نہ کام آئی مری آزردہ جانی
کفِ ساقی میں ہے نورٌ علیٰ نور
مئے گلگوں نہ جامِ ارغوانی
نہ اُن کی بے وفائی معتبر ہے
محبّت میں نہ میری بد گمانی
جبینِ یار پر غصّے میں حسرتؔ
فروزاں ہے جمالِ سر گرانی

کیسے روکیں چارہ سازی کیا کریں
خوئے دل ہے عشق بازی کیا کریں
خاکساری پیشہ ہیں اُن کے فقیر
آرزوئے سرفرازی کیا کریں
غارتِ دل سہل ہے اُن کے لئے
اہتمامِ ترک و تازی کیا کریں

زاہدوں کی نیتّوں میں ہے فتور
اِدّعائے پاک بازی کیا کریں

ہو چکے جو حُسنِ مطلق کے مُرید
وہ سرِ عشقِ مجازی کیا کریں

رکھنی ہے اہلِ وفا کی شرم اُنھیں
اعترافِ بے نیازی کیا کریں

دلبری حسرتؔ ہے فطرت حُسن کی
حُسن والے دل نوازی کیا کریں

رونقِ دل یوں بڑھا لی جائے گی
غم کی اک دُنیا بسا لی جائے گی

آ پڑا ہے عاشقی سے واسطہ
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

میری جانب وہ توجّہ کی نظر
بزمِ دشمن میں چھُپا لی جائے گی

ہوں گی پُوری اُن کی سب فرمائشیں
ایک بھی ہم سے نہ ٹالی جائے گی

بے نیازِ این و آں ہے نازِ یار
آرزو کی بات خالی جائے گی

بے رخی سے کام وہ لیں گے مگر
خُوب جب چاہت بڑھا لی جائے گی

صحتِ بیمارِ غم کے واسطے
اُن کے دامن کی ہوا لی جائے گی

میری بے تابی سے شوخی آپ کی
جب خفا ہو گی منا لی جائے گی

دل نہ توڑو حسرتِ ناکام کا
زُلف تو پھر بھی بنا لی جائے گی

تمکنت اُن کی بڑھی شوق مرا کم نہ ہُوا
فیصلہ عاشقی و حُسن کا محکم نہ ہُوا

سُن کے اُن سے کہ مرے جور کی توہین ہُوئی
منفعل ہے سرِ تسلیم کہ میں خم نہ ہُوا

کیوں مری خاطرِ مجموعہ پریشاں نہ ہوئی
تیرے گیسو کی خطا کیا ہے جو برہم نہ ہُوا

تو نہ آیا تو شبِ غم ترے بیماروں کا
دردِ دل اور بڑھا دردِ جگر کم نہ ہُوا

چھوڑ کر اس بتِ بدخو کی محبّت حسرتؔ
کہتے ہو کھا کے قسم کہ تمہیں کچھ غم نہ ہُوا

ستم کو جزو سمجھتے ہو دل رُبائی کا
یہ کیا طریق یہ کیا ڈھب ہے آشنائی کا

وہ اپنے حُسن کی تنقیص کرتے ہیں مجھ سے
یہ ایک طرفہ نمونہ ہے خود ستائی کا

نیازِ عشق یہی ہے تو کچھ بعید نہیں
غرورِ حسن جو دعویٰ کرے خدائی کا

نگاہ داریِ آدابِ عشق نے شبِ غم
سبق دیا مرے نالوں کو نارسائی کا

جسے نہ سوزِ محبّت سے کچھ بھی ہو سروکار
اُسے حرام ہے دعویٰ غزل سرائی کا

بغور دیکھ رہے ہیں تری وفا کے اثر
مآل اہلِ ہوس کی گریز پائی کا

کچھ اُن کی رنجشِ بیجا سے ڈر نہیں حسرتؔ
کہ ہے خلوص کو متوقع ابھی صفائی کا

معیشت میں بہ ہر سو رنگِ فطرت ہے جہاں میں ہوں
اخوّت ہے جہاں میں ہوں، سویّت ہے جہاں میں ہوں

مقامِ فرد بھی محفوظ ہے فوزِ جماعت میں
نمایاں ہر طرف وحدت میں کثرت ہے جہاں میں ہوں

اصولِ اشتراک آئینِ بیتُ المال سے مشتق
اساسِ کارِ جمع و خرچ ملّت ہے جہاں میں ہوں

فلاحت ہو کہ حرفت، کامیابی سعیِ انساں کی
نظامِ اجتماعی کی بدولت ہے جہاں میں ہوں

بری ہے فکر یاں ہر فرد کی لوثِ عقیدت سے
مسلّم اقتدارِ علم و حکمت ہے جہاں میں ہوں

رواجِ بربریت ہے مذاہب کے تعصب میں
فضائے امن و صلح آدمیت ہے جہاں میں ہوں

بلا تائیدِ محنت کچھ بھی افزائش جو ہو حسرتؔ
وہ دولت کے لئے اک طوقِ لعنت ہے جہاں میں ہوں

وصل کے شوق کا جو وصل سے ایفا نہ کرے
عشقِ صادق جو ہو مخلص بھی تو ایسا نہ کرے

اس پر افسوس کہ بینائے محبت ہو کر
جلوۂ دوست کا ہر شے میں تماشا نہ کرے

تابِ دیدار نہ ہو جس کو خود اس کا ہے قصور
عشق اس حسنِ نظر سوز کا شکوا نہ کرے

فطرتِ حسن پہ کچھ فرض نہیں پرسشِ غم
اسکی مرضی پہ ہے موقوف کرے یا نہ کرے

تجھ کو دعویٰ توکّل ہے تو لازم ہے کہ تو
فکرِ امروز بہ اندازۂ فردا نہ کرے

مرجعِ عشق ترا حسنِ مسلّم ہے تو پھر
کیا کرے کوئی اگر تیری تمنا نہ کرے

مجھ کو صبر و خرد و ہوش سے بیگانہ کیا
اور ابھی دیکھئے کیا کیا دلِ شیدا نہ کرے

التفاتِ ستمِ خاص ہے کافی حسرتؔ
حسن سے عشق توجہ کا تقاضا نہ کرے

حسن بے پردہ بے نقاب نہیں
کیا حجابِ نظر حجاب نہیں

وقفِ ہل من مزید ہے لبِ شوق
ستمِ یار بے حساب نہیں

اور ہے کیا جو بزمِ ساقی میں
میکشوں کے لئے شراب نہیں

فتنۂ روزِ حشر ہے بیدار
شب یہ ہیں وہ محوِ خواب نہیں

جانِ حسرت پہ قہر ہے غمِ ہجر
جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں

ہم سے دانستہ جو خطاب نہیں
کیا توجہ یہ اجتناب نہیں

متبسم یہ برہمی کیسی
تیغ گویا ہے جس میں آب نہیں

میری مایوسیوں کی حد نہ رہی
دل کو اب آرزو کی تاب نہیں

مئے گلگوں کی روشنی میں کہیں
دخل تاریکیٔ سحاب نہیں

ان کے دل میں ہے جا مگر حسرت
ان کی محفل میں باریاب نہیں

بلبلِ بے کس سے کیا پوچھیں نشیمن تھا کہاں
باغباں بھی جب یہ کہتا ہو کہ گلشن ہے کہاں
جوہری بم کی یہی گر کار فرمائی رہی
حسرت اک دن خلق پوچھے گی کہ لندن ہے کہاں

یہی اب تو نتیجہ ہے کہ بہ زہدِ نخوت انگیز
یہ جو تھا بصد تکلف مجھے شکل مے سے پرہیز

اسے ختم کردے ساقی بہ عطائے رافت آمیز — بہ خدا کہ جرعہ دہ تو بہ حافظِ سحر خیز
کہ دعائے صبح گاہی اثرِ کند شمارا

فارغ از وسوسۂ سود و زیاں خواہد بود — تا دل از ولولۂ عشق جواں خواہد بود
تا نصیبِ ہوسِ انسِ بتاں خواہد بود — تا زمیخانہ دمے نام ونشاں خواہد بود
سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

بے عدو حسن ہے تیرا مری خواہش بے حد — بدعتی کہتے ہیں مجھ کو تو کہیں اہلِ خرد
عاشقی پیشہ ہے دل نیک سمجھتا ہے نہ بد — بہ زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

جب کہے خواب میں خود آکے وہ شاہِ خوباں — جب کہ حافظ بھی مصدق ہو بہ فالِ دیواں
تجھ کو حسرتؔ یہ مبارک سند و مہر و نشاں — پردہ بردار کہ تا سجدہ کنند جملہ جہاں
طاق ابروئے تو محراب جہاں خواہد بود

جذبۂ شوق کی تاثیر دکھانا ہے مجھے — آپ رو رو کے خود ان کو بھی رلانا ہے مجھے
قابلِ دید ہے مجبوریٔ دل کا عالم — ابھی آئے تھے جہاں سے وہیں جانا ہے مجھے
یوں تو روشن ہے سب ان پر مرے دل کی خواہش — ہمنوا ان کی زباں کو بھی بنانا ہے مجھے
بدگمانی کا برا ہو کہ خفا ہیں دونوں — اب نہ آنا ہے کسی کو نہ بلانا ہے مجھے

تجھ پہ آکر جو ستایا تھا مجھے دل نے کبھی
تجھ سے اب ہو کے جدا دل کو ستانا ہے مجھے

پائے بوسی کی تمنّا میں ترے نقشِ قدم
کہیں مل جائیں تو آنکھوں سے لگانا ہے مجھے

کوچۂ یار چھٹتا ہے نہ چھٹے گا حسرت
خاک میں اب تو یہیں مل کے دکھانا ہے مجھے

شفاعت کا لوائے احمدی جس دن اُٹھا ہوگا
ہمارے ہاتھ میں دامانِ شاہِ کربلا ہوگا

گواہی پیش ہوگی جس گھڑی خونِ شہادت کی
تو حق میں پیروانِ حق کے بیشک فیصلا ہوگا

سپر بن جائیگی جب دوستی آلِ محمّد کی
رجائے مغفرت میں منتقل بیمِ سزا ہوگا

خطائیں بخشدی جائینگی لاریب اہلِ عصیاں کی
بتول و حیدر و حسنین کا جب واسطا ہوگا

ڈریں حسرت جنھیں ڈر ہو عقوباتِ محبّت کا
ہمیں تو آج بھی معلوم ہے اُس روز کیا ہوگا

پھر سے تقدیر آزمانا چاہیے
ربط اُنھیں سے پھر بڑھانا چاہیے

بُجھ گئی تھی دل میں جو شمعِ اُمیّد
اس کو پھر روشن کرانا چاہیے

حُسن کی بے مہریوں کے سب گلے
آرزُو کو بھُول جانا چاہیے

آئینہ بنی بے عملی بے خللی کا
اِک طرفہ نمونہ ہے یہ نعم البدلی کا

فطرت ہے بری شائبہ شرک سے میری
خطرہ ہے مجھے کچھ نہ خفی کا نہ جلی کا

اے حُسن ترے ناز کی خدمت میں قدیمی
حاصل ہے مجھے فخر نیازِ ازلی کا

بخشا ہے پسندیدگیٔ خلق نے یکسر
درجہ مرے اشعار کو ضرب المثلی کا

جنسِ ہوس ارزاں ہے خریدار جہاں ہو
اس وقت خدا جانے وہ عیّار کہاں ہو

یہ شان بھی اچھی ہے ترے بے خبروں کی
ہر لحظہ اگر نام ترا وردِ زباں ہو

ہے میرے لئے محفلِ اغیار بھی اک چیز
پر شرط یہ ہے تو بھی وہاں جلوہ فشاں ہو

ہے شوق کو منظور وہی اُن کی توجہ
جس شان توجہ پہ تغافل کا گماں ہو

کھل جائے بھرم دعوئ پرہیز کا حسرت
کاش اُن کی زباں ہو کبھی اور میرا دہاں ہو

خمِ نقشیں سے نہ مینا سے نہ کچھ جام سے ہے
رونقِ محفلِ ساقی مئے گلفام سے ہے

بدگماں آپ ہیں کیوں آپ کا شکوہ ہے کسے
جو شکایت ہے ہمیں گردشِ ایام سے ہے

مر مٹے ہم تو وہ کہتے ہیں یہ ہے غم سے فرار
اپنے حق میں غرض اُن کی فقط الزام سے ہے

آ بھی چکئے کہیں اب جلد کہ بیتاب ہے شوق
انتظام آپ کی آمد کا سرِ شام سے ہے

آپ کیا پوچھتے ہیں ہجر میں دل کی حالت!
آپ کی یاد جو ہمدم ہے تو آرام سے ہے

آپ سے توڑ کے اُمّید کے سارے رشتے
اب ہمیں کام جو کچھ ہے غمِ ناکام سے ہے
آپ حسرتؔ کو یہ کیا کہتے ہیں دشمن ہے مرا
آپ کا نام اسی عاشقِ بدنام سے ہے

بلا نوشی بھی کیوں ہو رہنِ مستی
نہ آتے تم تو کیا حسرت برستی
ترے غم سے عجب عالم ہے دل کا
تمنّا ایک حالت پر ہے قائم
حدِ اندازۂ تخمیں سے باہر
نہ بدلی خوئے خوبانِ جفا کوش
حیا مجبور تھی خواہش جنوں خیز

زہے آئینِ دینِ مے پرستی
مزارِ عاشقاں پر فاتحہ کو
کہ یہ نگری اُجڑتی ہے نہ بستی
بلندی جس کی پیدا ہے نہ پستی
متاعِ عشق ہے مہنگی نہ سستی
گئی جانِ وفا کیشاں ترستی
نہ کی حسرتؔ نے پھر بھی پیش دستی

ہماری بے خبری کا بھی کچھ ٹھکانا ہے
کہاں سے آئے ہیں جانے کہاں کو جانا ہے
مگر یہ اصل سے پیوستگی کی ہے اک شکل
غرض وصال سے ہے موت اک بہانا ہے

جیتے رہے تسکینِ محبت کے سہارے ——— ہم شوق کے مارے
مونس رہے اس پرسشِ پنہاں کے اشارے ——— ہر حال میں ہارے
دل کر نہ سکا حوصلۂ ترکِ تمنّا ——— اُس شوخ سے اصلا
ہم کو بھی یہی ضد تھی مگر اُس کا نتیجہ ——— نکلا یہ کہ ہارے
صد شکر وہ ہے پھر بہ سرِ لطف و عنایت ——— از راہِ مروّت
اب پھر ہے وہی بات "کہ ہم اُن کے ہیں حسرت ——— ہیں پھر وہ ہمارے"

گزرا اسی طرف سے جو ہے کاروانِ شوق
ہر ہر قدم پہ اب بھی ہیں پیدا نشانِ شوق
البتہ دیدنی ہے یہ وارفتگی کی شان
ہیں کیسے والہانہ دواں، رہ روانِ شوق
پہنچیں گے جلد منزلِ مقصود تک ضرور
لاریب ہے یہ جنسِ گراں بھی ازانِ شوق
قابو میں ان کو دیکھ کے دل ہے نہ ہے دماغ
ہو کس زباں سے دیکھئے شرحِ بیانِ شوق
حسرت جو کاروبارِ محبت یہی رہا!
چمکے گی خوب شہرِ خرد میں دکانِ شوق

رنگ روئے طرب بھی زرد رہا — دل بہر حال رامِ درد رہا
زیرِ دشمن بھی حوصلہ میرا — مردِ ہنگامۂ نبرد رہا
تھا بہت گرم عاشقی کا مزاج — سو بھی اُن کے حضور سرد رہا
تیرے قربت میں باوجودِ خطر — عشق بیباک رہ نورد رہا
اس جفا کار سے بھی کر کے نباہ — حسرتِ اہلِ وفا میں فرد رہا

بر سرِ لطف ہے وُہ جانِ جہاں آج کی رات
دیدنی ہے یہ محبت کا سماں آج کی رات
کھنچ کے آجائے خود آغوشِ تمنا میں جو حُسن
پیریٔ عشق بھی ہو جائے جواں آج کی رات
بے کہے اُن پہ ہے روشن مرے دل کی حالت
بے زبانی ہوئی جاتی ہے جواں آج کی رات
شوق کی حد میں ہے باوصفِ نقا شوقِ لقا
غرضِ شوق ہے بے نام و نشاں آج کی رات
التفات ان کی نگاہوں کا ستم ہے حسرت
شکر بھی دل کی زباں پر ہے فغاں آج کی رات

شوق کا شکوۂ رنگیں کبھی نہ ہوگا شاید — حسن کی خاطرِ نازک پہ گراں آج کی رات
کیا عجب ہے کہ مریضانِ ہوس کے حق میں — خود وہ ہو جائیں مسیحائے زماں آج کی رات
کیوں نہ ہوں اہلِ ریا سر بگریبانِ ملال — کامرانی ہے نصیبِ دگراں آج کی رات

طلبِ لذتِ آزار سے کچھ بھی نہ ہوا — اس جفا پیشہ ستمگار سے کبھی کچھ نہ ہوا
پھر کبھی صیاد کو توفیقِ ترحم نہ ہوئی — شیونِ مرغِ گرفتار سے بھی کچھ نہ ہوا
وہ عیادت کو جو آئے بھی تو بیگانہ رہے — نظرِ آخرِ بیمار سے بھی کچھ نہ ہوا
نگہِ خلق میں پھر بھی نہ بڑھی کچھ عظمت — شیخ کے جبہ و دستار سے بھی کچھ نہ ہوا
حسن کے جورِ تغافل میں ترقی کے سوا — شوق کے گریۂ ناچار سے بھی کچھ نہ ہوا
مژدۂ وصل نہ ملنا تھا نہ حسرت کو ملا — انفعالِ نگہِ یار سے بھی کچھ نہ ہوا

تصور میں وہی پیشِ نظر تھا — نہ جانے دل میں وہ پنہاں کدھر تھا
بسِ یک جنبشِ بادِ حوادث — ثبات اپنا چراغِ رہ گذر تھا
تری بے اعتنائی کی بدولت — تمنا کا جہاں زیر و زبر تھا
میانِ حسن و عشق اک ربطِ باطن — گہے رہبر تو گاہے نامہ بر تھا
نظر مجھ پر کرم کی تھی اگر تھی — بظاہر تھا ترا غصہ اگر تھا
ترے زیرِ قدم آنے کا مشتاق — مرا سر تیرے پائے ناز پر تھا

نہ چھوٹی ہم سے حسرت عشق بازی
یہ سب کس کی توجّہ کا اثر تھا

پھر یاد جو آئی ہے مدینے کی بُلانے
کیا یاد کیا پھر مجھے شاہِ دوسرا نے
ایسا ہے تو پھر فکر ہے کیوں زادِ سفر کی
کیا غیب کے کھُل جائینگے مجھ پر نہ خزانے
میں غلبۂ اعدا سے ڈرا ہوں نہ ڈروں گا
یہ حوصلہ بخشا ہے مجھے شیرِ خدا نے
تھا شب کو جو میں حاضرِ دربارِ محمد
چھوڑا ہے اثر دل پہ عجب اُس کی فضا نے
حسرت مجھے اس جانِ جہاں سے ہے تعلق
سمجھے کہ نہ سمجھے کوئی جانے کہ نہ جانے

پھر کیوں تری طلب میں نہ ہوں جان و دل فدا
جب مانتے ہیں سب کہ یہ نعمت ہے بے بہا
دُنیا سے منھ کو موڑ کے اے محوِ ذاتِ حق
ہم عاصیوں کے پاس کبھی خواب میں تو آ
کیا کیا ہیں کیا بتاؤں مرے دل کی خواہشیں
وابستہ تیری ذات ہے اے جانِ مدّعا
عشّاق کی نظر میں ترا ظِلّ عاطفت
ہے خیلِ آرزو کے لئے سایۂ ہُما
ترا ستم بھی ہم پہ کرم ہے زہے ستم
تیری جفا بھی ہم کو وفا ہے زہے جفا

تیرے خرامِ ناز سے گلشن کی ہر روش
ہر دم ہے منتظر کہ قیامت ہو کب بپا
حاشا و زینہار کہ اے جانِ حسن و عشق
حسرتؔ کے دل میں اور بھی کچھ ہو ترے سوا

سوچا بہت پہ ہم کو نہیں آج تک پتہ
کچھ دل نے کی خطا کہ ہوئے یوں ہی تم خفا
تم کو نگاہِ شوق سے دیکھا تو کیا ہوا
کچھ جرم تو نہیں جو یہ ہو درخورِ سزا

پیمانِ وفا کے ایما کا، ہم اُن سے تقاضہ بھول گئے
اس کا بھی تو اب احساس نہیں کیا یاد رہا کیا بھول گئے
تم جب سے ہوئے ہو ہم سے جدا اپنا بھی وہ مسلک ہے ٹھیرا
لوگوں میں جس سے یہ چرچا، ہم بھی تمہیں گویا بھول گئے
دینی جو انھیں ہوتی نعمت خود ہی وہ دیتے کیا حسرتؔ
کیوں تم نے طلب میں کی سبقت آئینِ تمنا بھول گئے

جب دور سے وہ گنبدِ خضرا نظر آیا
اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آیا
ہر چار طرف بارشِ انوار کا عالم
موجود پئے دیدۂ بینا نظر آیا

مسجد میں جو تھا متصلِ روضۂ اطہر
اک قطعہ وہ جنت کا نمونہ نظر آیا
البتہ سکوں بخشی و خوشبوئی کی رُو سے
ہر حصۂ دُنیا سے نرالا نظر آیا
حق بینی کو اس روضۂ اطہر کا منارا
ہم مرتبۂ عرشِ معلےٰ نظر آیا
ہم ہجر کے ماروں کو اسی قرب میں یک سر
بیمارئ فرقت کا مداوا نظر آیا
البتہ جو محرومِ سکوں تھا دلِ حسرتؔ
آخر وہ یہیں آکے شکیبا نظر آیا

مذاقِ عشق برخوردار کر دے
مجھے محوِ جمالِ یار کر دے
مرے سرمایۂ ہوش و خرد کو
بیک حکمِ جنوں بیکار کر دے
نہ کیونکر ہو کہ جب وہ خود بلائیں
تو زہدِ خشک بھی انکار کر دے
عجب کیا گر مرا خوں از سرِ نو
ترے خنجر کو جوہر دار کر دے
بس از ترکِ ہوس کیا ہو جو وہ شوخ
کہیں پھر شوق کو بیدار کر دے
تماشا ہو جو توفیقِ الٰہی
انھیں خود ہی مجھے خود دار کر دے
مرا ذوقِ ستم اے کاش حسرتؔ
اسے بھی ضد میں بے آزار کر دے

رندوں کیلئے میخانے میں کچھ قحطِ مئے گلفام نہیں
محروم نہ رہتا کوئی مگر ساقی کی نوازش عام نہیں
مخصوصِ کرم ہے بھی کوئی معلوم نہیں یہ کسی کو بھی
غیروں کی شکایت بھی ہے یہی میرا ہی خیالِ خام نہیں

تقدیر کا شکوہ کیوں میں کروں ہر حال میں راضی کیوں نہ رہوں
تعمیلِ تمنا کیوں چاہوں، ایسا ہو تو حسرت نام نہیں

بادِ نسیم ادھر سے کہ بادِ صبا چلی — بادِ مُراد ہو کے چلی جو ہوا چلی
فرقت میں یادِ یار کی اللہ رے بے رُخی — ہم سوچتے ہی رہ گئے کیا آئی کیا چلی
دعویٰ ترکِ عشق پہ مجھ کو تری نظر — کیا کچھ نہ طعن و طنز کی باتیں سُنا چلی
میری وفا کا ذکر بھی بے صرفہ آگیا — محفل میں تیری بات جب اے بے وفا چلی
حسرت غرورِ حسن کی خدمت میں عاشقی — پھر بے قرار ہو کے پئے التجا چلی

خُو نہ چھوٹی گناہگاری کی — حد ہے یہ اپنی شرمساری کی
دل میں پیدا ہے نورِ حبِّ جمال — باوجودِ کمالِ تاریکی
نکلیں آنسو برائے عفوِ گناہ — کہ ضرورت ہے آبِ جاری کی
بے ہشی میں بھی حالِ دل نہ کھلا — رہ گئی شرم پردہ داری کی
جور کو جور جان کر بھی تو ہم — خُو نہ ڈالیں گے آہ و زاری کی
شکوہ سنجی کو غم نواز کیا — عاشقی نے وہ طرفہ کاری کی
تو نے حسرت پہ خوب ڈالی ہے — طرحِ نو آرزو نگاری کی

یہ مجال کس کی ہے اے پری کہ ترے جنوں کی دُعا کرے
جو کرے بھی کوئی تو وہ کرے جسے اس کا اہل خدا کرے

نہ تجھے کرم سے ہے واسطہ، نہ ہے درگزر ہی کا حوصلہ
کس اُمید پر ترے رُوبرو، کوئی اعترافِ خطا کرے

تری بے نیازیٔ حسن کا، یہ ہے عاشقوں سے مطالبہ
نہ کوئی کرم کی ہوس کرے، نہ کوئی ستم کا گلا کرے

تجھے کچھ بھی خوفِ خدا نہیں، یہ طریق کیا ہے کہ اے حسیں
تو اُسی کا دشمن جاں بنے دل و دیں جو تجھ پہ فدا کرے

مجھے حسرت آج بھی یاد ہے، وہ حسن کا مصرعِ غمنوا
نہ دوا کرو، نہ دُعا کرو، کوئی مر نہ جائے تو کیا کرے

کس کو چاہوں اور میں تیرے سوا
لیس للانسان الا ما سعیٰ

کر سکے تجھ پہ نہ جان و دل فدا
ہو سکا ہم سے نہ تیرا حق ادا

طرّہ نہ لف ان کا ہوتا ہے دُوتا
دیکھئے کس کس پہ آئے یہ بلا

کر اِدھر بھی ایک ایمائے کرم
اے کہ تیری ذات ہے بحرُالسّخا

کوئی دُنیا میں کہاں تیری مثال
با جمال و با کمال و دل رُبا

رُوح پرور ہے ہوائے کاخِ دوست
جاں فزا ہے اُس کے کوچے کی ہوا

قسمتِ حسرت کی محرومی نہ پوچھ
بے اثر ہے آہ نالہ نارسا

جب نظر وہ دیار آتا ہے
گریہ بے اختیار آتا ہے
دل مراحل کے عشق سے گویا
بر سرِ روزگار آتا ہے
دیکھیے کب شکیب حسرت کو
شکرِ غم پر قرار آتا ہے

شوق کو دادِ حیا ملتی نہیں
وہ نگاہِ آشنا ملتی نہیں
بوئے کوئے یار سے یا وصفِ غم
نکہتِ بادِ صبا ملتی نہیں
شیوۂ اہلِ ریا سے زینہار
خوئے اربابِ صفا ملتی نہیں
دیدنی ہے یہ مروّت حسن کی
جرمِ الفت کی سزا ملتی نہیں
ان سے ملنے کی ہوس میں شوق کو
ڈھونڈھتا ہے اور دُعا ملتی نہیں
آشکارا ہو کہ پنہاں وہ نظر
ملتی تو ہے اور کیا ملتی نہیں
عاشقی سے خوئے نازِ حسنِ دوست
بر سبیلِ اعتنا ملتی نہیں
یہ بھی حسرت کیا ستم ہے عشق سے
حسن کی دادِ جفا ملتی نہیں

تمام شد